تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

سلیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب: سید عابد علی عابد کے تصورِ اسلوب کے تناظر میں

مقالہ نگار

صائمہ کوثر

227-FLL/MSURDU/F19

نگران

ڈاکٹر صباحت مشتاق

لیکچرر، شعبہ اُردو

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

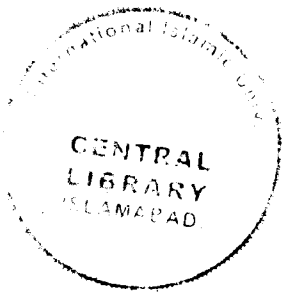

K
Accession No. TH-27420

MS
891.439309
ص ا س

سلیم اختر - تنقید و تشریح

اردو نثری ادب - تاریخ و تنقید

ادبی اسلوب - اردو

عابد، سید صابد علی، 1906-1971 - تنقید و تشریح

اردو افسانہ - تاریخ و تنقید

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **SAIMA KOUSAR**

Title of the Thesis: سلیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب، سید عابد علی عابد کے تصورِ اسلوب کے تناظر میں

Registration No: **227-FLL/MSURD/F19**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu
Islamabad

External Examiner:

Dr. Safdar Rasheed
Assistant Professor
Allama Iqbal Open University
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Sabahat Mushtaq
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,
Islamabad

بسم الله الرحمن الرحيم

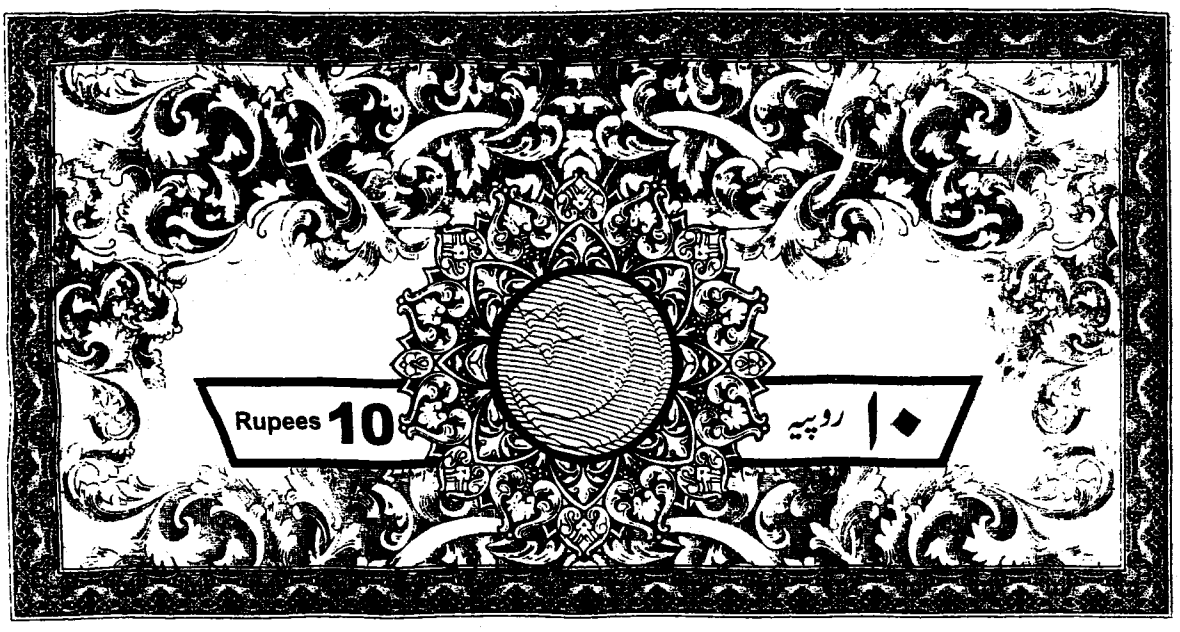

﴿حلفیہ بیان﴾

من مسماۃ صائمہ کوثر دختر مظہر حسین اعوان یونیورسٹی رجسٹریشن نمبر 227-FLL/MSURDU/F19 شناختی کارڈ نمبر 61101-4444767-2 سکنہ پنڈ گاگڑی، ڈاکخانہ سہالہ، تحصیل وضلع اسلام آباد کی رہائیشی ہوں اور بقائمی ہوش وخواس خمسہ بلاجبر واکراہ جبر غیرے سے بلاترغیب دیگرے بخوشی خود حلفاً درج ذیل اقرار کرتی ہوں:۔

ا۔ یہ کہ من مظہرہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، سلام آباد، شعبہ اردو، رجسٹریشن نمبر 227-FLL/MSURDU/F19 اور برائے ایم ایس اردو کی سکالر ہونے کی حیثیت سے اپنا مقالہ عنوان نسیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب: سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کے تناظر میں، نگران استاد، ڈاکٹر صباحت مشتاق مکمل کیا ہے۔

یہ کہ من مظہر مسماۃ صائمہ کوثر دختر مظہر حسین اعوان اس بات کا حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ ہذا ہر قسم کے سرقہ سے پاک ہے۔ اور مسماۃ صائمہ کوثر دختر مظہر حسین اعوان نے مقالہ ہذا کو کسی اور ڈگری کے لئے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ پیش کروں گی۔ ان تمام حقائق کا اقرار کرتی ہوں کہ میں نے کوئی امر مخفی نہیں رکھا۔ لہذا غلط بیانی کی صورت میں ہر قسم کی ذمہ داری من مظہرہ پر عائد ہوگی۔

مندرجہ بالا مراتب میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں اور اس میں کوئی امر مخفی یا پوشیدہ نہ رکھا گیا ہے۔

لرقوم 13-08-2023

الحلفہ

صائمہ کوثر دختر مظہر حسین اعوان

شناختی کارڈ نمبر 61101-4444767-2 فون نمبر ----------

رجسٹریشن نمبر 227-FLL/MSURDU/F19

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ صائمہ کوثر رجسٹریشن نمبر 227-FLL/MSURDU/F19 نے ایم۔ایس۔اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"سلیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب: سید عابد علی عابد کے تصورِ اسلوب کے تناظر میں"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر صباحت مشتاق

لیکچرر، شعبۂ اُردو

پیش لفظ

علم کی تمنا انسان کو مشکل حالات سے لڑنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیتی ہے۔

اپنے خیالات و افکار کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا "اسلوب" کہلاتا ہے۔ ہر انسان کا اسلوب اس کی شخصیت، سوچ، نظریات کے مطابق تبدیل ہوتا ہے۔

اس مقالے میں سلیم اختر کی افسانوی نثر کا جائزہ سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کے تناظر میں لیا گیا ہے۔ اس کے چار ابواب ہیں۔

پہلے باب میں اسلوب کی تعریف اور عابد علی عابد کے اسلوب کے حوالے سے بیان کردہ تصورات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد دوسرے باب میں فکری صفات سادگی، قطعیت اور اختصار کے تحت پرکھا گیا ہے اور تیسرے باب میں جذباتی صفات، زورِ بیان، گداز، مزاح کے تناظر میں دیکھا گیا ہے جبکہ چوتھے باب میں تخیلی صفات، تجسیم، خیال افروزی اور تصویریت کے تحت جائزہ لیا گیا ہے۔

میں اس کام کی تکمیل میں اپنے اساتذہ کرام کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس کے بعد اپنے والدین، بہن بھائیوں اور دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔

صائمہ کوثر

اگست ۲۰۲۳ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
	باب اوّل:	
	حصہ اول: اسلوب کی تعریف و توضیح	۱
	حصہ دوم: سید عابد علی عابد کے نظریات کی روشنی میں اسلوب کی تفہیم	۹
	حوالہ جات	۱۷
	باب دوم:	
	سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کی فکری صفات کے تحت سلیم اختر کی	
	افسانوی نثر کا جائزہ	۱۹
	حوالہ جات	۵۶
	باب سوم:	
	سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کی جذباتی صفات کے تحت سلیم اختر کی	
	افسانوی نثر کا جائزہ	۶۰
	حوالہ جات	۸۴
	باب چہارم:	
	سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کی تخیلی صفات کے تحت سلیم اختر کی	
	افسانوی نثر کا جائزہ	۸۷
	حوالہ جات	۱۰۲
	ماحصل	۱۰۴
	کتابیات	۱۰۷

باب اوّل

حصہ اوّل: اسلوب کی تعریف وتوضیح

حصہ دوم: سید عابد علی عابد کے نظریات کی روشنی میں اسلوب کی تفہیم

باب اول:

حصہ اوّل:

اسلوب کی تعریف و توضیح

اسلوب کی اصطلاح بہت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس سے پہلے اسلوب کے لیے زبان و بیان، انداز، اندازِ بیاں، طرزِ بیاں، طرزِ تحریر، لہجہ، رنگ سخن جیسے الفاظ استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ادب میں کوئی بھی مصنف یا فرد مختلف الفاظ، تراکیب، انداز اور استعارات کے ذریعے سے اپنے خیالات کو قلم کے ذریعے کاغذ پر اُتارتا ہے جسے عام طور پر اسلوب کہا جاتا ہے۔ پس کسی بھی خیال، نظریے اور فکر کو زبان اور قلم کے ذریعے سے بیان کرنے کو اسلوب کہتے ہیں۔ جب کہ کسی بھی سائنسی نظریے کے مطابق کسی بھی ادبی فن پارے کی بات کی جائے تو زبان و بیان اور قواعد کے مطابق ادب پارے کا اندازِ تحریر بے حد اہم سمجھا جاتا ہے جس طرح ایک ہی زمین سے مختلف پھول گلاب، چنبیلی اور موتیا اُگتے ہیں اور اپنے رنگ و خوشبو میں ایک دوسرے سے رد و بدل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اسلوب بھی ہر فرد کا ذاتی اور شخصی ہوتا ہے جس سے اندازِ تحریر میں انفرادیت پیدا ہوتی ہے اور کوئی دوسرا فرد اس کو چرا نہیں سکتا۔ اسلوب کبھی بھی جمود کا شکار نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ادیب اور فرد کی شخصی و طبعی رجحان اور معاشرے میں ہونے والے اُتار چڑھاؤ اور ادبی صنف کی ہیئت کے تحت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ لفظ "اسلوب" انگریزی کے "اسٹائل"(Style) سے مترادف ہے۔ یونانی میں "اسٹائیلاز (Stylos)"اور لاطینی میں" اسٹائیلس (Stylus)"اسلوب کا ہم معانی ہے اور ہندی میں "شیلی" کہتے ہیں۔"[1]

> اسٹائل (Style) کا مادہ یونانی زبان کا کلمہ (Stylos) ہے جس کی دوسری شکلیں Stulus , Stile , Stilus ہیں۔ یہ قدیم زمانے کا اوزار تھا جس سے مٹی یا پتھر کی الواح پر اہم واقعہ، شعر یا کہانی لکھی جاتی۔ یہ سٹلوس لوہے کا نوک دار قلم ہی تھا۔"[2]

اس طرح انگریزی ڈکشنری اور اُردو لغات میں اسلوب کے معنی مختلف انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

A Dictionary of Phrase and Fable کے مطابق:

> Style is a form the Latin styles an iron pencil for writing on waxen tablets etc..[3]

طرز "لاطینی طرز" کی ایک شکل ہے۔ موم کی گولیوں پر لکھنے کے لیے لوہے کی پنسل وغیرہ۔

The Concise Oxford Dictionary کے مطابق:

> Style n & v.t. in ancient writing implement small rod with pointed end for scratching letters on wax covered -tablets and blunt end for obliterating, thing of similar shape esp. for engraving, tracing etc gromon of sundial, (Bot) narrow extension of ovary supporting stigma 2 manner of writing speaking or doing esp, as contrasted with the matter to be expressed or thing done. 3 collective characteristics of the writing or diction or way of presenting things or artistic expression or decorative methods. Proper to a person or school or period or subject manner exhibiting these characteristics.[۴]

دی کونسائیز ڈکشنری کے مطابق اسٹائل زمانہ قدیم میں لکھنے کے لیے استعمال ہونے والے نوکیلے قلم کو کہتے ہیں جس سے موم کی ٹکیوں پر لکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں اس کے اصطلاحی معنی بھی بیان کیے گئے ہیں یعنی لکھنے، بولنے یا کام کرنے کے مخصوص طریقہ جو کسی شخص، دبستان، دور یا موضوع کی خصوصیات کا حامل ہو۔

New Webster's Dictionary of English Language کے مطابق:

> Style: , syiln (Fr. Style L.stilus, style of stake, pointed instrument , style for writing hence mode of expression, root of stimulus, stick, sting, spelling , influenced , by gr.styles, a pillar) Manner of writing or speaking with regard to language, that which has to do with from rather than content in a

piece of literature, distinctive manners of writing belonging to an author or body of authors, a characteristics mode of presentation in any way of the fun art.[۵]

نیو ویبسٹری ڈکشنری نے بھی اس کے معانی پرانے زمانے میں لکھائی کے لیے استعمال ہونے والا نوکیلا آلہ بتائے ہیں۔اس کے اصطلاحی معانی کی بھی وضاحت کی ہے یعنی طرزِ تحریر یا کسی مصنف یا کسی ایک ادبی حلقے سے تعلق رکھنے والے مصنفین کا اندازِ نگارش یا فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے کسی بھی فن کا مخصوص انداز۔

انگریزی کی لغات کے مطابق Style لکھائی کے لیے استعمال ہونے والا نوکیلا آلہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ طرزِ تحریر، طرزِ اظہار اور طرزِ بیان کا نام بھی ہے۔

اُردو لغات میں اسلوب کی اصطلاح کے لیے جو وضاحتیں دی گئی ہیں اس میں لغوی معنی کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ ہی اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔

> لفظ اسلوب عربی لفظ اسلوب (ا+س+ل+و+ب) مذکر واحد سے مشتق ہے جس کی جمع اسالیب (ا+س+ا+ل+ی+ب) مذکر ہے ۔ اُردو میں بعض لوگ اُسلوب کے بجائے اَسلوب یعنی الف پر پیش کے بجائے زیر کی آواز سے تلفظ کرتے ہیں۔ لغات میں پیش ہی کی آواز کو تسلیم کیا گیا ہے۔[۶]

اس وضاحت میں اسلوب کا مادہ اور آپس کی ترکیب واضح کی گئی ہے لیکن لغوی معانی کا تذکرہ کہیں نہیں کیا گیا۔

نور اللغات کے مطابق: "اسلوب (ع بالضم مذکر) راہ، صورت، طرز، روش، طریقہ، بندھنا، لازم، صورت پیدا ہونا، راہ نکلنا۔"[۷]

اردو لغات میں اسلوب کی تعریف زیادہ تر اصطلاحی معنوں میں کی گئی ہے۔

رافع اللغات کے مطابق اسلوب کے معانی ہیں: "انداز، ڈھنگ، طور، طرز، طریقہ، سلیقہ، طرزِ تحریر، اسٹائل، راہ، صورت۔"[۸]

یہاں پر بھی لغوی معنی کے بجائے اصطلاحی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔

کشاف تنقیدی اصطلاحات میں اس کا مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اسلوب "Style" سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ، ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہار و بیاں کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت (انفرادی خصوصیات) کے شمول سے وجود میں آتا ہے اور چونکہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتادِ طبع، فلسفہ حیات اور طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے ہیں۔ اِس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے۔[9]

گویا طرزِ اظہار میں مصنف کی فکر اور اس کی شخصیت کا عکس شامل ہوتا ہے۔

درجہ بالا تعریفوں میں شاعروں یا ادیبوں کے طرزِ تحریر پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن اسلوب کے لغوی معنی بیان نہیں کیے گئے ہیں جو کہ تشنگی کا باعث ہیں، اس لیے ہمیں ناقدین کے آراء سے رہنمائی حاصل کرنی ہوگی۔

بفن (Buffon) کے مطابق:

Style is the man himself.[10]

اسلوب مصنف کی ذات ہے۔

مغربی مصنف ایمرسن (Amerson) کے مطابق:

A man style is his mind ,voice.[11]

اسلوب مصنف کا فکری اظہار ہے۔

افلاطون کے مطابق: "جب فکر کو شکل دے دی جاتی ہے تو اسلوب جنم لیتا ہے۔"[12]

گویا خیالات، تصورات، نظریات کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنا اندازِ بیان ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مطابق:

اسلوب (Style) کوئی نیا لفظ نہیں ہے۔ مغربی تنقید میں یہ لفظ صدیوں سے رائج ہے۔ اردو میں اسلوب کا تصور نسبتاً نیا ہے۔ تاہم "زبان و بیاں"، "انداز"، "انداز و بیاں"، "طرزِ تحریر"، "لہجہ"، "رنگ"، "رنگ سخن" وغیرہ اصطلاحیں اسلوب یا اس سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ یعنی کسی بھی شاعر یا مصنف کے اندازِ بیاں کے خصائص کیا ہیں، یا کسی صنف یا ہیئت میں کس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے یا کسی عہد میں زبان کیسی تھی اور اس کے خصائص کیا تھے وغیرہ یہ سب اسلوب کے مباحث ہیں۔ ادب کی کوئی پہچان اسلوب

کے بغیر ممکن نہیں۔[۱۳]

یعنی مصنف کے طرزِ تحریر کی خوبی، ہیئت اور عہد کی زبان اسلوب کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند، احمد ندیم قاسمی اور اقبال آن کا دور ایک ہے لیکن طرزِ فکر مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے اسلوب میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔

پروفیسر عباس نقوی کے مطابق: "اسلوب سے مراد کسی انشا پرداز کا وہ مخصوص فنکارانہ طریقہ کار ہے جس کی مدد سے وہ اپنے جذبات واحساسات قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔"[۱۴]

یعنی تحریر پڑھ کر اندازِ بیان کے ذریعے مصنف کی شناخت ممکن ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق: "اسلوب تحریر کی کسی ایک صنف کا نام نہیں بلکہ اسلوب در حقیقت مصنف کی پوری ذات کا عکس اور اس کا مطالعہ ہے۔"[۱۵]

یعنی طرزِ تحریر مصنف کی شخصیت کے مطالعے کا نام ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اسلوب کے اجزائے تشکیل میں کون سے عناصر کارفرما ہوتے ہیں؟ اور اس کی کتنی اقسام ہیں؟

ادبی اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قابل مطالعہ یعنی دلچسپ ہو اور اس میں ابلاغ کی قوت موجود ہو اس لیے یہ ادراک حاصل کرنا بہت ضروری ہے کہ اسلوب کیسے تشکیل پاتا ہے اور اس پر کون سے عناصر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پروفیسر عباس اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> اسلوب بیاں کی تشکیل میں پانچ عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ مصنف، ماحول، موضوع، مقصد اور مخاطب۔ گویا اسلوب کے تعین میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ بات کون کہہ رہا ہے، کس زمانے میں کہہ رہا ہے، کیا کہہ رہا ہے، کیوں کہہ رہا ہے اور کس سے کہہ رہا ہے؟[۱۶]

اسلوب کی تشکیل میں یہ سوالات بہت خاص ہیں۔ کہ اول مصنف کی علمی صلاحیت اور ادب کے متعلق اس کی کیا رائے ہے؟ وہ قدامت پسند ہے؟ یا جدت پسند ہے؟ اس کا ادبی ذوق کیا ہے؟ اور موضوع کے متعلق اس کی کیا رائے ہے؟ وغیرہ۔

مصنف کے بعد ماحول یا عہد بہت خاص ہوتا ہے یعنی جس دور میں کوئی ادب پارہ وجود میں آتا ہے تو اس وقت کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات اثر انداز ہوتے ہیں جن کی جھلک مصنف کی تحریر میں واضح دکھائی دیتی ہے۔ کیوں کہ اسلوب اپنے زمانے کی پہچان ہے ایک دور کو دوسرے دور سے الگ کرتا ہے۔ اگر تحریر پر اپنے دور کے ادبی ذوق کے اثرات مرتب نہ ہوں تو اس کی شہرت میں کمی کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح اسلوب کی تشکیل میں

موضوع بہت اہمیت کا حامل ہے اور موضوعات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ادبی، علمی، تاریخی، افسانوی، صحافتی وغیرہ ہر موضوع کا اسلوب مختلف ہونا چاہیے کیونکہ ہر موضوع کے لیے ایک جیسا انداز نہیں اپنایا جا سکتا۔ مثلاً کسی افسانے میں صحافتی اندازِ بیاں میں لکھنا اسے ادب کے دائرے سے باہر نکالنے کی مانند ہے۔

اسلوب کی تشکیل میں یہ نکتہ بہت خاص ہے کہ مصنف کن سے مخاطب ہے اور ان کا تعلق کس طبقے سے ہے کیوں کہ موضوع کے متعلق لکھتے وقت اپنے مخاطب کی ذہنی سطح کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس طرح مغرب سے مشرق تک اسلوب کی کل اِکیس متنازعہ قسمیں متعین ہوتی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ تعقیدی اسلوب
۲۔ مذہبی اسلوب
۳۔ مقفیٰ، مسجع، مرجز اسلوب
۴۔ تمثیلی حکایتی اسلوب
۵۔ رنگین مرصع اسلوب
۶۔ محاوراتی اسلوب
۷۔ بنیادی اسلوب
۸۔ سپاٹ و سادہ اسلوب
۹۔ بیانیہ اسلوب
۱۰۔ توضیحی اسلوب
۱۱۔ انانیتی اسلوب
۱۲۔ شگفتہ یا تاثراتی اسلوب
۱۳۔ طنزیہ یا ظرافت آمیز اسلوب
۱۴۔ خطیبانہ اسلوب
۱۵۔ حکیمانہ فلسفیانہ اسلوب
۱۶۔ مرقع نگاری یا محاکاتی اسلوب
۱۷۔ استعاراتی اسلوب
۱۸۔ اسلوبِ جلیل

۱۹۔ علامتی اسلوب

۲۰۔ ہیجانی، ماورائی یا منتشر خیالی کا شکستہ اسلوب

۲۱۔ امتزاجی اسلوب" [۷]

مذکورہ بالا اسلوب کسی نہ کسی سطح پر فن یا موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔

حصہ دوم:

سید عابد علی عابد کے نظریات کی روشنی میں اسلوب کی تفہیم

سید عابد علی عابد ممتاز شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، اقبال شناس، معروف تنقید نگار، بے مثال مترجم اور نامور ماہرِ تعلیم کے طور پر اردو کی نابغہ روزگار شخصیت ہیں۔ آپ ایک صاحبِ اسلوب ناقد، محقق، تنقید نگار، مترجم اور ماہر تعلیم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ نے اسلوب کے حوالے سے کام کیا اور اپنا ایک الگ مقام بنایا۔

سید عابد علی عابد نے اسلوب کے مباحث میں مختلف ناقدین خاص طور پر مغربی ناقدین کے آراء سے خود کو مستفید کیا۔ وہ اسلوب کے مختلف معنوں کی وضاحت کرتے ہیں اور اس ضمن میں پروفیسر مرے (Murry) کے کلمہ اسٹائل کے تین معنوں کو تعبیر کرتے ہیں۔ پروفیسر مرے (Murry) نے تین فقرات تحریر کیے ہیں اور ان میں انگریزی ادیبوں کا تذکرہ کیا ہے مگر عابد علی عابد نے اس کی جگہ مشرقی ناقدین کے اسلوب کا جائزہ لیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ میں جانتا ہوں کہ پچھلے ہفتے کا امروز میں حالاتِ حاضرہ پر کس نے نوٹ لکھا تھا۔ یہ نوٹ لکھنے والا احمد ندیم قاسمی تھا۔ اس کا اسلوب ایسا ہے کہ گویا کسی نے چھاپ لگا دی ہو۔ اشتباہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ [۱۸]

۲۔ پچھلی اتوار کو مشرق میں مصر اور یہودیوں کی لڑائی کے متعلق جو کچھ امیر الدین صاحب نے لکھا ہے (فرضی نام سے) وہ دلچسپ تو ضرور ہے لیکن ابھی انہیں لکھنے کا سابقہ حاصل کرنا چاہیئے، سر دست تو ان کا کوئی اسلوب نہیں۔ [۱۹]

۳۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد بڑی پیچیدہ ترکیبیں استعمال کرتے ہیں اور مغلق الفاظ کام میں لاتے ہیں لیکن ان میں ایک صفت ایسی ہے جو ان کے اس تمام طمطراق کے باوجود اور خندہ آور تصنع کے باوصف ان کو مستحق احترام بنا دیتی ہے اور ان تمام عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ ان کے لکھنے کا ایک خاص اسلوب ہے۔ [۲۰]

پہلے فقرے میں اسلوب جس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ وہ لکھنے والے یعنی صاحبِ اسلوب کا انفرادی طرز نگارش ہے جو اس کو دوسرے لکھنے والوں سے ممتاز کرتا ہے یعنی جس کی طرزِ تحریر کو پڑھ کر بغیر کسی جھجک کے یہ

کہہ دیا جائے کہ اس کا خالق فلاں شخص ہے کیونکہ اس میں زبان، اس جیسی تراکیب، اس جیسے الفاظ اور اس کے پیچ و خم نہ صرف اس شخص کے سر ہی جاتا ہے جیسے ہم اُردو ادب میں سر سید، حالی اور شبلی کی تحریروں سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زبان اور یہ انداز تو خاص سر سید کا ہی ہو سکتا ہے کیوں کہ اس سے بہتر منطقی، استدلالی اور سائنسی گفتگو کرنا کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی معاملہ شاعر حضرات کے ساتھ بھی ہے۔ غالبؔ، میرؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کے فن کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص کی تخلیق منفرد ہے۔ لہذا قاری کے لیے کوئی مشکل کام نہیں کہ وہ شعرا کے کلام میں امتیاز نہ کر سکے کیونکہ ان کے خاص اسلوب کی چھاپ ان کے فن میں نمایاں ہوتی ہے۔ گویا بہتر اسلوب دوسرے مصنفین سے صاحبِ طرز نگاہ کو مختلف اور ممیز کر دیتا ہے۔

دوسرے نقطے میں جو اسلوب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا انداز تو دلچسپ ہے مگر اس کا کوئی خاص اسلوب نہیں ہے یعنی لکھنے والا فنِ اظہار کے مختلف پیرایوں پر قدرت نہیں رکھتا جو اس کو ابلاغ کے کامل اظہار میں معاون ثابت ہو اور اس کی انفرادیت کے عنصر کو شامل کیا جائے۔ محض افکار اور نظریات کو دوسروں تک پہنچانا کوئی خاص گوہر نہیں۔ وہ گوہر نایاب تب ہو گا جب اس میں ایک چاشنی اور رنگینی خیال اور اُتار چڑھاؤ ہو گا۔

اب تیسرے جملے میں اسلوب کا لفظ جس معنی میں استعمال ہوا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارلو میں تصنع اور الفاظ کا طمطراق کیسا ہی کیوں نہ ہو بہر حال اس کا ایک اسلوب خاص ہے یہی اسلوب مطلوب و مقصود فن ہے اور ایسا اسلوب جو مطلوب فن اور مقصود ادب ہو انفرادیت سے ماورا ہوتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا اظہار ہمیشہ منفرد طریقے پر ہوتا ہے یہاں اسلوب اپنے معانی مطلق میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں فن کار کی ذات اور آفاقی اقدار گویا مل جل کر ایک ہو گئی ہیں۔ اسی اسلوب میں فن کار اپنی ذاتی واردات اور تجربات کو آفاقی تجربات کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ غم ذات کو غم جہاں بنا دیتا ہے۔ غم یار غم روزگار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ اسلوب ادبی تخلیق کا نقطہ عروج ہے اس کے بغیر کلاسیکی عظمت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

سید عابد علی عابد نے پروفیسر مرے (Murry) کے نظریے یا ان کے بیان کردہ ان تین نکات کے ذیل میں اسلوب کے بہت واضح معنی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے ان تین نکات میں تمام مشکل اور سادہ معنوں کو بیان کیا ہے۔ عابد علی عابد نے انہی تین نکات کو آگے طول دیا ہے اور ان کے ذیل میں اسلوب کی ضمنی خصوصیات کو بیان کیا ہے جو کہ محقق نے اپنے تنقیدی اور نظری خاکے کے لیے منتخب کی ہیں۔ عابد علی عابد نے اسلوب کی خصوصیات کو

بیان کیا ہے جن میں سادگی، قطعیت، اختصار، زورِ بیان، گداز، مزاح، تجسیم، خیال افروزی، تصویریت شامل ہیں۔ ذیل میں ان کی وضاحت کی جائے گی۔

۱۔ سادگی:

سادگی کے متعلق سید عابد علی عابد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> جہاں بنیادی محرک یا فکر کا وہ پہلو جو بنائے ادب بنتا ہے، سادہ ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہوتی تو سادگی (جسے سلاست اور صفائی بھی کہا جا سکتا ہے) پیدا ہوتی ہے۔ یہاں الفاظ بھی معانی کے لوازم کے پہلو بہ پہلو سادہ ہوتے ہیں اور مطلب بالکل واضح ہوتا ہے۔[۱۲]

یعنی نثر میں سادگی کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ تو سادہ ہی ہوں مگر ان کے معانی بھی سادہ ہونا ضروری ہیں کیوں کہ بعض مرتبہ شاعر یا ادیب الفاظ تو سادہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ استعارات بھی آسان اور روزمرہ کے استعمال کرتے ہیں مگر ان کے معنی بہت گہرے ہوتے ہیں جو ایک عام قاری کو آسانی سے سمجھ نہیں آتے۔ مگر کبھی کبھی صورتحال اس کے برعکس بھی ہوتی ہے کہ بندشوں، الفاظ و تراکیب، استعارات اور علامتی زبان کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے مگر معنی میں بہت سادگی موجود ہوتی ہے اور وہ پورے پورے معنی دیتا ہے جس سے ایک عام قاری اور ادب جاننے والا دونوں ہی لطف اُٹھا سکتے ہیں مگر عابد علی عابد کے نزدیک الفاظ و معانی دونوں میں ہی سادگی کا عنصر ہونا چاہیئے کیوں کہ یہ خوبی دراصل نثر کو سادہ کہلانے کے قابل بناتی ہے۔

شعر اور نثر دونوں میں اس کا اطلاق مختلف ہوتا ہے۔ شعراء فکری عنصر کو بیان کرتے ہیں تو ان کے ہاں جذبے کا عنصر شدید ہوتا ہے۔ شعر کا لہجہ اور کسی خاص لفظ پر زور یا استفہام سے ایسے معانی کا پیدا ہونا جو سادہ الفاظ کے باوجود سادہ نہیں ہوتے۔ یعنی سادہ الفاظ سے سادہ معانی پیدا ہونا یہاں ضروری نہیں ہے جبکہ نثر میں اس کے برعکس الفاظ سادہ سے سادہ اور آسان مفہوم نکل کر آنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

۲۔ قطعیت:

قطعیت کے حوالے سے سید عابد علی عابد اپنی رائے بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> سادگی کے مقابلے میں قطعیت اسلوب کی وہ صفت خاص ہے جس میں فکر کے سب رشتے پیچیدہ اور جذبے کے پہلو دقیق ہوتے ہیں۔ ان کی آمیزش طبعاً ایسے الفاظ کا تقاضا کرتی ہے جو

چاہے مغلق اور پیچیدہ ہوں۔ لیکن وضاحت مطلب کہ اعتبار سے وہ کسی طرح سادگی سے کم نہ ہوں۔ میں اسی کو قطعیت کہتا ہوں اور سادگی سے اسے ممیز کرتا ہوں۔ [۲۲]

عابد علی عابد کے نزدیک الفاظ کا سادہ ہونا ضروری نہیں ہے مگر معنی و مفہوم میں سادگی اور کم از کم اتنی صلاحیت ہو کہ وہ آسانی سے مطلب دے سکیں اور قطعی طور پر عبارت یا جملہ اپنا مفہوم ادا کر سکے۔ جیسے صاحب "اخلاق جلالی" کے ہاں دقیق اور پیچیدہ ترکیب آتی ہیں مگر وہ اپنا مطلب قطعیت سے پڑھنے والے تک پہنچا دیتے ہیں اور یہی انشائے ابوالفضل کا حال ہے۔

فقرے طویل اور تشبیہ واستعارات سے بھرپور ہوں گے لیکن ان کا مطلب صاف اور واضح ہو گا۔ عابد علی عابد قطعیت کے متعلق جو کہ اسلوب کو بنیادی وصف ہے۔ اس کی وضاحت میں یہی چاہتے ہیں کہ عنوان گویا مشکل ہو اور اس کا بیان مشکل اور پیچیدگی سے گھرا ہوا ہو مگر معنی میں مطلب کی وضاحت ہونا بہت ضروری ہے یعنی معنی و مفہوم میں قطعیت لازمی ہے۔

۳۔ اختصار:

سید عابد علی عابد نے اختصار کے زمرے میں کئی مغربی نقادوں کے حوالے دیے ہیں مگر وہ اس نقطے میں یہ بیان کرتے ہیں کہ:

اسلوب میں اصل مراد کے بیان کرنے میں جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں یا تو مدعا کے مساوی ہوتے ہیں اور اس کو مساوات کہتے ہیں۔ یا اس سے کم اور ناقص الفاظ میں مدعا ادا کیا جاتا ہے۔ مگر ان الفاظ سے مدعا نکل آتا ہے اس کو ایجاز کہتے ہیں یا ادائے مدعا میں کچھ الفاظ بڑھ جاتے ہیں مگر بے فائدہ نہیں ہوتے تو اس کو اخلال کہتے ہیں۔ [۲۳]

یعنی اختصار وہ ہے جس میں اصل معنی یا مراد کو کم سے کم الفاظ میں بیان کیا جائے مگر کسی قسم کی تشنگی باقی نہ رہے جب کسی فکر یا خیال کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس خیال یا فکر کے کچھ اپنے مخصوص الفاظ ہوتے ہیں جو انہی کو بیان کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ تصوف کے بارے میں بیان کرنے والا انہی خاص الفاظ کا سہارا لیتا ہے جو اس کے موضوع کی مکمل تشریح کرنے میں معاون و مددگار ہوتے ہیں مگر اس کی تحریر میں اختصار تب آئے گا جب وہ اپنے مقصد کے بیان میں الفاظ کم استعمال کرے گا مگر جو خیال و فکر وہ پہنچانا چاہتا ہے اس میں کوئی خلل نہ آئے یعنی یہاں الفاظ کم سے کم استعمال ہوئے ہیں مگر مفہوم اور مدعا مکمل طور پر بیان ہوا ہو۔ عابد علی عابد

کے نزدیک یہی اختصار کی عمدہ مثال ہے۔

۴۔زورِ بیان:

عابد علی عابد کے نزدیک زور بیان کی صفت نثر کی نسبت شاعری میں زیادہ موجود ہوتی ہے۔اس حوالے سے وہ مغربی مصنف آگڈن کے زبان کے استعمال کے دو طریقوں کو بیان کرتے ہیں۔ ایک تحویلی (Referential)اور دوسرا جذباتی(Emotional)۔اس حوالے سے وہ مزید بیان کرتا ہے کہ :

> تحویلی طریقہ افکار واشیاء کا حوالہ دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جذباتی طریقہ اس غرض سے اختیار کیا جاتا ہے کہ ان افکار واشیاء سے جو جذبات یا خیالات پیدا ہوتے ہیں ان کو بروئے کار لایا جائے۔ سائنس اور نثر کی زبان تحویلی ہوتی ہے جب کہ شاعری کی زبان جذباتی۔[۲۴]

عابد علی عابد آگڈن(Ogdan) کے خیال سے مکمل طور پر متفق ہوتے ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب اسلوب میں اسلوب کی صفت زور بیان کے حوالے سے بیشتر مثالیں شاعری کی ہی پیش کی ہیں۔ شیلی نے *Force or vigour of style* کا ترجمہ زور کلام یا زور بیان کیا ہے اور بہت بہترین کیا ہے کیونکہ زور اشتدادِ جذبات کا حامل ہے۔

۵۔گداز:

گداز کے لغوی معنی غم،اندوہ، مصیبت کے ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی "انسانی زندگی یا تجربات کی وہ صفت جو رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرے یا خارجی حالات میں کوئی ایسا تغیر جس سے یہی ذہنی کیفیت پیدا ہو۔"[۲۵]

چیمبر کی بیسویں صدی کی لغت کہتی ہے :" وہ صفت جو رحم کے جذبات اکسائے۔جذبات واحساسات کے متعلق کوائف (Pathetic)وہ اسلوب جو انداز تحریر میں رحم کے جذبات اکسائے۔"[۲۶]

سید عابد علی عابد نے Pathas جس کا ترجمہ گداز کیا ہے۔ان کے نزدیک دراصل Pathasروح انسانی کی لطیف ترین کیفیات کو کہتے ہیں اور دکھ یا درد، جذبات وتاثرات لطیف میں شامل ہیں۔اس لیے غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جب دکھ کا بیان نہ کیا جائے، گداز کی صفت پیدا نہ ہو گی۔ درحقیقت روحِ انسانی کی دھوپ چھاؤں میں ایسے مقام بھی آتے ہیں کہ دکھ سے بھی اپنا رشتہ جوڑتے ہیں لیکن لطافتِ خیالات سے بھی نہیں کٹتے۔ یہی Pathetic جذبات ہیں۔

۶۔مزاح:

مزاح جو انداز کی صفات جذباتی میں شمار ہوتا ہے۔اس کے متعلق وائلڈ کہتا ہے:"خندہ آور شے کا شعور، بیہودہ اور بے ثمر باتوں پر ہنسنے کا ملکہ، نرم نرم زبان میں بیہودگیوں کی طرف اشارہ کرنا بشرطیکہ اس میں ہمدردی شامل ہو۔"[۲۷]

چیمبر کی لغت بیسویں صدی میں ہے۔"ایک ملکہ ذہنی جو عجیب اور خندہ آور چیزوں کا شعور کرتا ہے۔ان سے مسرت حاصل کرتا ہے اور ہمدردانہ ان پر ہنسنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"[۲۸]

طنز کے متعلق وائلڈ (Wilde) کہتا ہے کہ:

> کوئی ایسا فن پارہ جس میں انسان کی کمزوریوں اور بیہودگیوں کو آئینہ دکھایا جائے، ریاکاری کی مذمت کی جائے اور ایسے معاشرے کی سخت اہانت کی جائے جس میں برائیاں اور ریاکاریاں راہ پاگئی ہیں۔[۲۹]

یعنی مزاح میں عام اور معمولی باتوں پر اس طرح ہنسنا کہ ہمدردی کا پہلو شامل ہو جبکہ طنز میں معاشرے میں پھیلی برائیوں کا اس طرح تمسخر اڑایا جائے کہ ان کی روک تھام ہو سکے۔

۷۔تجسیم:

سید عابد علی عابد کے مطابق Concreteness یا تجسیم اس صفتِ اسلوب کو کہتے ہیں جہاں تمثال اور پیکر تراشے جائیں اور ان باریک خیالوں کو جو ہوا کی طرح لطیف ہیں الفاظ لطیف کا جسم معنوی بخشا جائے۔اس سلسلے میں دراصل استعارے کو جو دراصل مجاز ہے تجسیم کہتے ہیں۔تشبیہ کو بھی اس لیے شامل تجسیم کر لیتے ہیں کہ استعارہ پیدا کرنے کا وسیلہ ہے اور یوں ذریعہ حصول مجاز بن جاتا ہے۔

مجازی زبان کے تین مقاصد ہوتے ہیں یعنی کلام کی خوبصورتی، مطلب کے مختلف پہلو اور گفتگو کا لطف۔بعض معنوں کے اظہار کے لیے مجازی زبان کے استعمال کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

۸۔خیال افروزی:

مغرب کے انشاء پردازوں اور نقادوں نے Suggestion کو اسلوب کی وہ صفت پراسرار قرار دیا ہے جس کا مفہوم کلیتاً دوسروں تک منتقل کرنا قریباً ناممکن ہے۔

سید عابد علی عابد نے اس کلمے کا ترجمہ خیال افروزی کیا ہے۔ یہ اسلوب کا وہ شیوہ خاص ہے اور نگارش کی وہ شعبدہ گری ہے جس کے اسرار و رموز صرف تخلیقی فن کار کو معلوم ہوتے ہیں۔ نقاد تو بعض اوقات یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم خیال افروزی کی نشاندہی تو کر سکتے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ صفت کس طرح وجود میں آئی۔ تخلیقی عمل کا یہ مرحلہ پراسرار ہے جہاں باریک بین نقادوں کی ژرف نگاہی، ہنر اور فن کے رموز کے سامنے سپر ڈال دیتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سر بسجدہ ہو جاتی ہے۔

انسان متنوع کیفیات سے متاثر ہوتا ہے جن کی پیچیدہ دلالتوں میں ایمائی اور رمزی کیفیتیں موجود ہوتی ہیں۔ ان کا تاثر اتنا فوری اور شدید ہوتا ہے اور ان کا شعور (Impact) اتنا برق مثال کہ قاری یا سامع ان رموز کو مورد انتقاد نہیں بناتا۔ نہ ان دلالتوں اور کیفیتوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ وہ تو گویا آنکھیں بند کر کے کچھ کیفیات اور تاثرات قبول کر لیتا ہے۔

پچھلی یادوں کو تازہ کرنے میں نکہت و رنگ و نور کا عنصر بہت دخیل ہوتا ہے۔ الغرض خیال افروزی نظر آئے گی وہاں بالعموم رنگ، نور، نکہت اور اس قسم کے تلازمے کسی نہ کسی روپ میں پس منظر میں قائم ہوں گے۔

۹۔ تصویریت:

سید عابد علی عابد کے مطابق میں نے انگریزی اصطلاح Picturesqueness کا ترجمہ تصویریت کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فنکار اصلاً قوتِ بصارت سے کام لے کر جن چیزوں کو ہم تک منتقل کرنا چاہتا ہے انہیں سلسلہ تصویر کی شکل میں دیکھتا ہے جو لوگ سینما کے کھیل کے لیے منظر نامہ لکھتے ہیں اِن کو علم ہے کہ جذبات ہوں یا افکار اچھا منظر نگار انہیں تصویروں کی صورت میں دیکھتا ہے اور اس کے لیے وہ استعارے سے بھی کام لیتا ہے لیکن زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ادراک کی تمام قوتیں اور اس کے حواس کی تمام صلاحتیں گویا بصارت کو اپنا محور بنا لیتی ہیں۔

تصویریت میں جو کچھ فن کار کو کہنا ہے۔ وہ تمثالوں اور پیکروں کے ذریعے یعنی تصویروں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ فکر اور جذبے کی آمیزش جوں کی توں موجود ہوتی ہے لیکن کیفیت مطلوب کا انتقال بصری راستوں سے ہوتا ہے۔

تصویروں میں باقی حواسِ خمسہ کی تمثالات بھی شامل ہیں یہ صرف تخیل کے ابتدائی کارناموں میں سے

ہے یعنی یہ وہ مقام ہے جہاں تخلیقی جوہر پیکر تراشتا ہے بے شک پیکر تراشی بڑی بات ہے، کرامات ہے طلسمات ہے۔ذیل میں عابد علی عابد کی بیان کردہ فکری، جذباتی اور تخیلی صفات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اگلے ابواب میں "سلیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب: سید عابد علی عابد کے تصورِ اسلوب کے تناظر "میں دیکھا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، س ن)، ص ۱۶۳۔

۲۔ جاوید لاہوری، "اسلوب کا مسئلہ" مشمولہ اوراق، سالنامہ جلد ۲ (لاہور: جنوری ۱۹۶۷ء)، ص ۱۸۵۔

۳۔ صباحت مشتاق، اردو افسانے میں اسلوب کا تنوع، مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی۔ اردو (ملتان: بہاءالدین ذکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء)، ص ۲۔

۴۔ دی کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری (*The Concise Oxford Dictionary*)، (برطانیہ: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۰۵۹۔

۵۔ نیو ویبسٹر ڈکشنری آف انگلش لینگویج (*New Webster's Dictionary of English Language*)، (امریکہ: دی ڈیلیئر پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۶ء)، ص ۹۷۳۔

۶۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، ص ۱۶۴۔

۷۔ مولوی نور حسن نیر، نور اللغات، جلد اول (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۱۹ء) ص ۳۱۱۔

۸۔ رافع اللغات (لاہور: الفیصل، ۲۰۰۵ء)، ص ۵۷۔

۹۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء)، ص ۱۳۔

۱۰۔ اشفاق حسین بخاری، اسلوبیاتی مباحث (اسلام آباد: شاخِ زریں، ۲۰۱۶ء)، ص ۸۳۔

۱۱۔ خلیل احمد بیگ، اطلاقی لسانیات (علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۵۔

۱۲۔ اشفاق حسین بخاری، اسلوبیاتی مباحث، ص ۵۶۔

۱۳۔ گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۱۹ء)، ص ۱۴۔

۱۴۔ مظفر عباس نقوی، اسلوبیاتی مطالعے (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۹ء) ص ۱۴۔

۱۵۔ سید عبداللہ، اشارات تنقید (لاہور: مکتبہ خیابان، ۱۹۶۶ء) ص ۳۷۴۔

۱۶۔ مظفر عباس، اسلوبیاتی مطالعے، ص ۳۵۱۔

۱۷۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، ص ۳۵۴۔

۱۸۔ سید عابد علی عابد، اسلوب (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۶ء) ص ۴۰۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۰۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۱۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۴۸۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴۸۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۶۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۶۱۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۶۲۔

باب دوم

سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کی فکری صفات کے تحت سلیم اختر کی افسانوی نثر کا جائزہ

باب دوم:

سید عابد علی عابد کے تصورِ اسلوب کی فکری صفات کے تحت سلیم اختر کی افسانوی نثر کا جائزہ

سلیم اختر کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی علمی و ادبی خدمات اور تحقیقی کاوشوں سے ادب کے شائقین ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔ آپ کی پہچان تین حوالوں سے معروف ہے۔ بطور نقاد، افسانہ نگار اور استاد۔

آپ ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان قاضیوں کا خاندان کہلاتا ہے۔ آپ کے والد قاضی عبدالحمید ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کے شعبے سے وابستہ تھے لیکن اس کے باوجود انہیں مطالعے کا بے حد شوق تھا اور اچھے ادیبوں اور شاعروں سے ان کی دوستی بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم اختر کو بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے اور خریدنے کے لیے گھر کا ماحول سازگار ملا جس نے آپ کی طبیعت میں جذبۂ تجسس کو بڑھا دیا اور آپ کی سوچ کے دھارے تیزی سے علمی پختگی کے زینے پر پروان چڑھتے گئے اور آپ کی طبیعت میں موجود طلب، جستجو، کھوج اور تلاش نے آپ کو اپنے خیالات، جذبات فکری اور طبعی میلان کو بیان کرنے کے لیے قوتِ اظہار عطا کی اور اس کے ساتھ ساتھ اندازِ تحریر کو ایسی روانی عطا کی جو آپ کی پہچان کے ساتھ آگے چل کر وجہ شہرت بنی۔

سلیم اختر نے آرنلڈ بینٹ (Arnold Bennett) کی مختصر کتاب *How to live on 24 hours a day* کا "صبح کرنا شام" کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی اور یہی سلیم اختر کی پہلی کتاب ہے۔ ۱۹۶۱ء میں سلیم اختر کا نیا روپ جنم لیتا ہے جس میں آپ فکرِ معاش اور اپنی خلوت نشینی سے نکلتے ہوئے زندگی کی حقیقت اور افادیت پر غور و فکر کرنے کا تجربہ کر رہے تھے۔ البتہ کتاب کے ساتھ دوستی نے سلیم اختر کو مستقبل شناس بنا دیا اور آپ نے ایم۔ اے اردو کا امتحان دینے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۶۱ء میں سیکنڈ ڈویژن میں امتحان پاس کر لیا۔

پونا، انبالہ اور ملتان شہر کی رہائش نے آپ کے علمی اور ادبی سفر پر مثبت اثرات مرتب کیے۔ چھٹی دہائی کا ملتان ادبی لحاظ سے بہت زرخیز تھا۔ جس نے سلیم اختر کے ذہنی اور فکری ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۲ء میں بطور لیکچرار ملتان چلے گئے۔ حقیقی معنوں میں تنقیدی سفر کا آغاز ہوا کیونکہ آپ نفسیات کا وسیع مطالعہ کر چکے تھے

اور ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد سلیم اختر اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میرا زاویہ نگاہ نفسیاتی ہے۔"[۱۱]

کیونکہ وہ نفسیات کا مطالعہ اتنی گہرائی سے کر چکے تھے جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو کسی ذاتی کوشش کے بغیر ہی خود بہ خود ان کا ایک نفسیاتی نقطہ نظر بن گیا، کیوں کہ نفسیات کے ذریعے سے تخلیق کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کی شخصیت کا مطالعہ بھی ممکن ہے اور سلیم اختر کو تخلیق کے مقابلے میں تخلیق کار نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ سلیم اختر نے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۲ء میں کیا۔ ابتداء میں ان کے افسانے جنسی رنگ لیے ہوئے تھے۔ افسانہ نگاری کے متعلق سلیم اختر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> افسانہ نگاری بھی مشاطگی ہے، ہیئت کے تقاضے، اسلوب کی جمالیات، متنوع احساسات اور متناقض جذبات کو تاثر کے محدب عدسے تلے یوں لانا کہ وہ آنچ دینے لگیں۔ معاشرہ اور افراد کے حوالے سے کرداروں کا خارجی رنگ اور اس کے برعکس ان کے باطن میں پنہاں کئی کشمکش کے طوفاں، سائیکی کی بھید بھری پرچھائیوں والا لینڈ اسکیپ، شعور اور لاشعور کے مابین رسہ کشی ان سب کی موثر تصویر کشی کو مشاطی سمجھتا ہوں۔ فطرت خود بخود لالہ کی حنابندی کرتی ہو گی مگر افسانہ کے لالہ کی حنابندی افسانہ نگار کو کرنا ہوتی ہے۔ افسانہ لکھنا مہینوال کی مانند اپنی ران کاٹ کر کباب بنانا ہے۔[۱۲]

اس اقتباس کے آخری جملے پر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ سلیم اختر افسانے کو اپنے وجود ہی کا حصہ بنا کر پیش کر رہا ہے۔ گویا تحریر اس کی اپنی ذات ہی کا عکس ہے۔ یہ اظہار تخلیقی لاشعور کا ذریعہ اور ابلاغ بھی ہے اور تخلیق کار کی بنیادی شخصیت کا ارتقاء بھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی ذات کے مرکز اور اُلجھنوں سے ظاہر ہوتا ہے اور پھر اپنے ماحول، واقعات، میلانات و رجحانات اور ذہنی تعصبات کا احاطہ کرتے ہوئے سماجی ممنوعات سے ٹکراؤ کی قوت پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

سلیم اختر کی ذاتی قوت ادراک اور مشاہدات کی ذہنی قوت کا ملاپ، تخلیقی ابلاغ کی شکل میں ان کے افسانوں میں ظاہر ہوتا ہے جنہیں مختلف نام دے کر افسانہ نگار ادب کے قارئین تک پہنچاتا ہے۔

افسانوں کے یہ مجموعے حیران کر دینے والے ناموں سے آراستہ تھے۔ کڑوے بادام(۱۹۸۸ء)، کاٹھ کی عورتیں (۱۹۸۹ء)، مٹھی بھر سانپ(۱۹۹۲ء)، چالیس منٹ کی عورت (۱۹۹۴ء)، آدھی رات کی مخلوق (۱۹۹۹ء) ان افسانوی مجموعوں نے اپنے اپنے دور میں ایک پہچان اور

شناخت حاصل کی کیوں کہ ان کے موضوعات عام انسانوں کے جنسی، معاشرتی اور تہذیبی رویوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں ان افسانوں کو نرگس اور کیکٹس کے نام سے افسانوی کلیات کی شکل میں شائع کیا گیا۔ ان افسانوں کی تعداد ایک سو سات ہے۔

اسلوب وہ انداز بیان ہے جسے مصنف اپنے خیالات، احساسات اور افکار کو بیان کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اپنے اندر موجود حق اور پہچان کے جذبے کی وجہ سے وہ ہر چیز پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس عمل میں وہ عام آدمی کی طرح پہلے اپنی جسمانی طاقت پر یقین رکھتا ہے۔ اس یقین کی ہار اور جیت اس کی زندگی اور تحریری زندگی پر بھرپور اثر چھوڑتی ہے۔ سلیم اختر نے بھی اپنے افسانے کی بنیاد اسی جسمانی احساسِ ملکیت پر رکھی ہے۔

تاریخ، ادب، عمرانیات اور نفسیات کے گہرے مطالعے نے سلیم اختر کی طرزِ فکر اور طرزِ بیان کو انفرادی لب ولہجہ عطا کیا جس کی وجہ سے سلیم اختر کو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ایک منفرد اور مختلف مقام حاصل ہے۔ اسی انفرادیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سلیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب سید عابد علی عابد کے اسلوب کے تناظر میں دیکھا جائے گا۔

اُردو ادب کے معروف اور معتبر نقادوں اور بعض مغربی ناقدین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ کون سی تحریر یا فن پارہ بہترین اسلوب کا حامل ہے۔ افسانہ ادبی صنف نثر ہے اور سید عابد علی عابد ادبی اسلوب کی بات کرتے ہیں اور اسلوب کی بحث میں اسلوب کی صفات کو بیان کیا ہے کہ ایک صاحبِ اسلوب کے ہاں ان صفات کا موجود ہونا اہم ہے۔ وہ اسلوب کی صفات کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسلوب کی صفات فکری، صفات جذباتی اور صفات تخیلی اور تین حصوں کو مزید ذیلی نکات میں تقسیم کرتے ہیں۔ صفاتِ فکری میں وہ سادگی، قطعیت اور اختصار کو شامل کرتے ہیں۔ صفاتِ جذباتی میں زورِ بیان، گداز، مزاح جب کہ صفاتِ تخیلی میں تجسیم، خیال افروزی اور تصویریت کو شامل کرتے ہیں۔ سلیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب پہلے صفات فکری کے ذیل میں دیکھا جائے گا۔ ذیل میں سادگی کی صفت کو بیان کیا جاتا ہے۔

صفات فکری:

ا۔ سادگی:

کسی تخلیق میں سادگی سے مراد یہ ہے کہ قاری کو بآسانی تمام باتوں کی آگاہی بغیر کسی اُلجھن اور رکاوٹ کے

ہو جائے یعنی وہ الفاظ کی سادگی سے تمام خیالات تک پہنچ سکے اور اسے پڑھنے میں کسی قسم کی مشکل پیش نہ آئے۔ الفاظ عام بول چال اور روز مرہ کے مطابق استعمال کیے گئے ہوں۔ عابد علی عابد نے سادگی کے ضمن میں کہا ہے کہ "الفاظ بھی معانی کے لوازم کے پہلو بہ پہلو سادہ ہوتے ہیں اور مطلب بالکل واضح ہوتا ہے۔"[۴]

یعنی الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کا مطلب بھی سادہ ہو کیوں کہ بعض اوقات الفاظ سادہ ہوتے ہیں مگر معنی پیچیدہ اور مبہم ہوتے ہیں۔ لہذا سادگی (جسے سلاست اور صفائی بھی کہا جا سکتا ہے) وہ ہے جہاں الفاظ اور معنی دونوں سادہ ہوں اور مطلب واضح ہو۔

سلیم اختر کی افسانوی نثر کا مجموعی اسلوب مختلف پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ افسانہ نگار اپنے افسانوں میں سماجی شعور کا خاص خیال رکھتا ہے۔ اور انسانی کمزوریوں، اذیت پسندی اور کج روی کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ کا تذکرہ ملتا ہے اور مصنف کی شخصیت کا عکس بھی نظر آتا ہے اور مصنف چند واقعات کو انتہائی سادگی سے بیان کرتا ہے اور ان کی منظر کشی اس انداز میں کرتا ہے کہ قاری پورے واقعے کو اپنی آنکھوں میں سمو کر از بر کر لیتا ہے۔

> ٹیپ ریکارڈ پر ڈانس کی دھن چل رہی ہے اور کھڑے مہمانوں سے بننے والے دائرہ کے درمیان دو تین جوڑے ناچ کے بہانہ ایک دوسرے سے لپٹے لڑکھڑا رہے ہیں۔ کچھ مہمان پی رہے ہیں تو بعض یوں ہی بلا وجہ ایک دوسرے سے چپکے کونوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ دور ایک صوفے کے پیچھے سے مجھے چار ٹانگیں آپس میں اُلجھی نظر آتی ہیں شاید میں زیادہ پی گیا ہوں یا زیادہ بور ہو گیا ہوں یہ چاروں ٹانگیں آدمیوں کی ہیں۔ میں سر جھکا کر آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھتا ہوں۔ پہلے سوچتا ہوں کہ جا کر تفتیش کروں پھر سوچتا ہوں لعنت بھیجو مجھے کیا۔[۵]

افسانہ "دو سیارے" میں مغربی طرز حیات اور اس میں رائج قباحتوں جیسے مرد و عورت کا ایک ساتھ ناچ گانا، شراب نوشی اور ہم جنس پرستی کی منظر کشی انتہائی سادہ اور آسان الفاظ میں کی گئی ہے کہ قاری بخوبی اس حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے کہ مغربی دنیا میں آزاد خیالی کے نام پر بے راہ روی عام ہے۔ اسی طرح مشرق کے لوگ اپنے روشن مستقبل اور خاندان کی خوشحالی کے لیے مغرب کا رخ کرتے ہیں اور وہاں پر ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ "میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ اپنے گندے اور غلیظ گھروندوں میں جو خواب دیکھتے ہیں لندن، پیرس اور نیویارک میں ان کی تعبیریں برعکس نکلتی ہیں۔"[۶]

سادہ اور آسان الفاظ میں غریب الوطن کے دکھ کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ "دو سیارے" کا موضوع مشرقی پاکستان کا المیہ ہے۔ سلیم اختر سادہ اور آسان لفظوں میں دونوں اطراف میں ہونے والے جانی نقصان اور اس کے نتیجے میں افراد میں پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھن اور غم و غصے کو بیان کرتے ہیں۔

> میں دل کو بہت سمجھاتا کہ ہمارے درمیان مذہب اور ملک کی دو ایسی خلیجیں ہیں جنہیں بانٹنا ناممکن ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ مشرقی پاکستان میں بہنے والے خون میں میرے بھائی اور کئی دوستوں کا خون بھی شامل تھا یہ سب کچھ بھلانا میرے لیے ناممکن تھا۔[۵]

سلیم اختر سادہ اور آسان الفاظ میں افسانے کے مرکزی کردار کے دکھ کو بیان کرتے ہیں کہ دلچسپی کے باوجود وہ محض اس لیے ہندوستان سے تعلق رکھنے والی خاتون سے دوستی نہیں کرتا کیوں کہ وہ اپنے پیاروں کا خون کبھی بھلا نہیں سکتا ہے اور اسی طرح ہندوستان سے تعلق رکھنے والی خاتون "اوشا" بھی اپنے رد عمل کا اظہار کرتی ہے۔

> کیا جنگ میں میرا کوئی نہیں مارا جا سکتا" پہلی مرتبہ اسے ایک اور روشنی میں نہائے دیکھ رہا ہوں"۔ میرا ایک ہی بھائی تھا۔ وہ چھمب میں تھا ایک گولہ ان کے مورچہ پر آ کر گرا اور اس کے ساتھیوں کی لاشوں کے ٹکڑے تک فضا میں بکھر گئے۔ ہم اس کی لاش نہ دیکھ سکے، اس پر بین نہ کر سکے، اس کی آرتی جلا کر گنگا میں پھول نہ بہا سکے، ہم کچھ بھی تو نہ کر سکے اور اب اس کی موت کی یادگار اس کی موت کا تار۔ کاغذ کا ایک بے معنی ٹکڑا جسے نہ کوڑے میں پھینک سکتے ہیں نہ سنبھال کر رکھ سکتے ہیں۔ میری ماں اس صدمہ سے نیم پاگل ہو گئی۔ دنیا میں ہم بھائی بہن ہی تھے۔ اسے کمیشن ملے زیادہ عرصہ بھی نہ ہوا تھا اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ سب نے کہا لڑکی منحوس تھی مگر میں سوچتی ہوں لڑکی کا کیا قصور۔ آخر یہ سب کس کا قصور تھا۔[۶]

سلیم اختر سادہ اور آسان الفاظ میں اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ جنگ ہمیشہ دونوں قوموں کے لیے دکھ کا باعث بنتی ہے۔ اگر کہانی کا مرکزی کردار اپنے بھائی اور دوستوں کا خون فراموش نہیں کر سکتا تو بھارت سے تعلق رکھنے والی خاتون اوشا بھی اپنے دل میں اکلوتے بھائی کی موت اور والدہ کے پاگل پن کے دکھ کو چھپائے ہوئے ہے۔ اقتباس کی آخری دو سطروں میں سلیم اختر سادہ اور آسان الفاظ میں سماجی شعور کو اُجاگر کرتے ہیں کہ عورت کبھی بھی کسی مرد کی موت کی ذمہ دار نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے ان اسباب اور محرکات کو تلاش کرنا چاہیے جو درپیش مسائل کے اصل ذمہ دار ہوتے ہیں۔

سادگی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ ادیب سادہ اور آسان الفاظ میں روانی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنا مدعا بیان کرتا ہے اور یہ خوبی سلیم اختر کی افسانوی نثر میں موجود ہے۔ جب انسان دیار غیر میں ہوتا ہے تو اس کو اپنے وطن سے جذباتی لگاؤ محسوس ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو سلیم اختر افسانے میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"آپ لندن سے خاصے بیزار نظر آتے ہیں۔"

"بے زار تو نہیں، البتہ بعض اوقات گھر کی یاد بری طرح سے آتی ہے۔ جی چاہتا ہے چپڑی روٹیاں ہوں، ساگ ہو، تیز مرچوں کی چاٹ ہو، دہی بھلے ہوں، حلوہ پوری ہو، گرم گرم جلیبیاں ہوں۔"

"بس بس!! میرے تو منہ میں پانی بھر آیا"

میں مذاق نہیں کرتا، آدھی رات تک انگریزی سننے کے بعد اب آپ کے منہ سے اردو سن کر عجیب سکھ کا احساس ہوا ہے۔

"سکھ کا"

"بالکل"

"آپ جن چیزوں کا ذکر کر رہے ہیں ان میں سے اکثر یہاں مل جاتی ہیں"

"مل تو جاتی ہیں لیکن بات نہیں بنتی لوہاری میں جا کر نہاری کھانے کا مزہ یہاں کیسے مل سکتا ہے۔ کمال کی بات ہے گھر پر میں نے کبھی ان چیزوں کی خواہش نہ کی تھی۔"[۸]

سلیم اختر سادہ اور آسان الفاظ میں اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں جو چیزیں وطن میں رہتے ہوئے ہمارے لیے غیر اہم ہوتی ہیں اور جن میں ہم کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے لیکن پردیس میں یہی چیزیں ہمارے لیے خاص بن جاتی ہیں جیسے دیسی کھانے، بازاروں میں بکنے والے چٹ پٹے اور لذیذ کھانے اور اپنی قومی زبان کو سن کر سکون محسوس ہونا یعنی پردیس میں ہماری ترجیحات اور احساسات بدل جاتے ہیں۔ مادی ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے مغربی سرزمین پر قدم رکھ تو دیتے ہیں لیکن ہر شے میں وطن کی یاد ستاتی ہے۔ "جیسے اچانک ہم خود کو ٹریفا لگار سکوائر میں پاتے ہیں جہاں کبوتروں کی غٹر غوں غٹر غوں سے مجھے اپنے یہاں کے مزار اور درگاہیں یاد آتی ہیں۔"[۹]

سادگی کے ساتھ مصنف اپنا مدعا بیان کرتا ہے کہ پردیس کے ہر منظر میں اپنے وطن کا عکس دکھائی دیتا ہے ۔ سلیم اختر کے افسانوں میں معاشرے میں رہنے والے عام انسانوں کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے جس کے ذریعے

مصنف معاشرے میں رائج ریاکاری اور منافقانہ رویے کی عکس بندی کرتا ہے۔ افسانہ "گریز پا" میں احساس ملکیت انسانی عیاری اور احساس جرم کی سادگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "وہ سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے وہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے مگر میری یہ نیت نہ تھی میں تمہارے پاؤں توڑنا نہ چاہتا تھا میں تو تمہیں ڈرا رہا تھا۔"[۱۰]

درج بالا اقتباس میں مصنف نے احساس ندامت کو سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔ سلیم اختر سماج کے دوغلے پن سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ عورت جب بھی پرواز کرنے کی کوشش کرے گی تو اس کے پر کاٹ دیے جائیں گے۔

> چوک کے ایک کونے میں وہ چھوٹی سی ریڑھی میں ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھی ہے لوگ اس کی جوانی دیکھتے ہیں پھر اس کی زخمی ٹانگیں اور ان پر بھنبھناتی مکھیاں تو رحم اور کراہت کے ملے جلے احساس سے ان کی جیب میں خود بخود پیسے اگل دیتی ہیں۔ اب اس کے باپ کو بھی اس کے پاس ٹھہرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کے مالک کو کیونکہ اسے بھی اور انہیں بھی علم ہے کہ وہ اب بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتی۔[۱۱]

اس افسانے میں مصنف نے پدرسری سماج کی عکاسی سادہ اور آسان الفاظ میں کی ہے۔ ایسے سماج میں مرد کو عورت پر ہمیشہ برتری حاصل ہوتی ہے اگر عورت اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے بغاوت کرتی ہے تو اس کے قریبی رشتے (باپ، شوہر) اس کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے معذور کر دیتے ہیں اور اس طرح اپنی انا اور مردانگی کو تسکین دیتے ہیں۔

افسانہ "ماں بیٹا" ایک جوان بیوہ اور اس کے بیٹے کی کہانی ہے جو ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں اور شادی کے بعد یہ محبت یکسر بدل جاتی ہے۔ ان کی محبت کو کہانی میں افسانہ نگار کچھ اس انداز میں بیان کرتا ہے۔

> ارے پگلے! یہ اتنے بڑے بڑے سرخ پھولوں والا سوٹ پہن کر میں کیا کروں گی؟ وہ ہنس کر کہتی "یہ عمر ہے ایسے رنگ پہننے کی بھلا؟" ارے ماں آج کل تو لڑکے یہ رنگ پہن رہے ہیں اب تو وہ بات ہی ختم ہوگئی کہ کون کون سا رنگ پہنے اور کون سا رنگ نہ پہنے۔ اب تو سب مرد عورت لال نیلے گہرے پیلے رنگوں میں پھرتے ہیں۔"[۱۲]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے سادہ اور آسان الفاظ میں ماں اور بیٹے کی بے تکلفانہ محبت کو بیان کیا ہے کہ بیٹے کی خواہش ہے کہ ماں کو اچھے لباس اور اچھی حالت میں دیکھے اور ماں کو کہتا ہے عمر کا کیا ہے آج کل یہ رنگ مرد حضرات بھی پہن رہے ہیں۔

افسانہ "نقلی چوکیدار" باپ کی بیٹی سے محبت کی کہانی ہے۔ بیٹی کی رخصتی کے بعد کا منظر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

> خالی گھر پر عجیب سناٹا چھایا تھا۔ بیشتر مہمان چلے گئے تھے چند رہ گئے وہ بھی سو رہے تھے بیوی بھی سو رہی تھی آسودگی اور اطمینان کی نیند، کھانا بے حد اچھا تھا۔ جہیز کو سب نے پسند کیا تھا۔ بری کی چیزوں نے کئی رشتہ دار عورتوں کو آگ لگادی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سسرال والے شریف لوگ معلوم ہوئے۔ لڑکا بھی بہت بھولا بھالا سا تھا۔ جلد ہی اطمینان کی سانس آسودگی کے خراٹوں میں تبدیل ہوگئی۔ باپ کے سواسب سوگئے تھے۔ بارہ ایک دو۔"[۱۳]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے سادہ اور آسان الفاظ میں بیٹی کی اچھی شادی کے انتظام کو بیان کیا ہے۔ سلیم اختر کو بیان میں مہارت حاصل ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں زندگی کے تمام مسائل کو بیان کر دیتے ہیں۔ درج بالا اقتباسات کا اسلوب کی صفت فکری کے ذیل میں سادگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۔ قطعیت:

عابد علی عابد نے اسلوب کی صفات فکری کے ذیل میں تین عناصر کو اہمیت دی جن میں سادگی، قطعیت اور اختصار شامل ہے۔ عابد علی عابد کے نزدیک قطعیت کے معنی درج ذیل ہیں۔

> سادگی کے مقابلے میں قطعیت اسلوب کی وہ صفت خاص ہے جس میں فکر کے سر رشتے پیچیدہ اور جذبے کے پہلو دقیق ہوتے ہیں۔ ان کی آمیزش طبعاً ایسے الفاظ کا تقاضا کرتی ہے جو چاہے مغلق اور پیچیدہ ہوں لیکن وضاحت مطلب کے اعتبار سے وہ کسی طرح سادگی سے کم نہ ہوں۔ میں قطعیت اسی کو کہتا ہوں اور سادگی سے اسے ممیز کرتا ہوں۔[۱۴]

عابد علی عابد کے ہاں سادگی سے مراد الفاظ اور معنی دونوں میں سادگی ہونا ضروری ہے یعنی کسی قسم کی پیچیدگی نہ ہو جبکہ قطعیت کو وہ سادگی سے ایک باریک سے نقطے پر الگ کرتے ہیں کہ الفاظ دقیق اور پیچیدہ ہوں مگر اس کے معنی و مفہوم سادہ ہونے چاہئیں۔

یعنی عابد علی عابد نے قطعیت کے ذیل میں کہا کہ الفاظ پیچیدہ ہوں مگر اس کے بیان میں clearity یعنی قطعیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس ضمن میں لکھنے والا تشبیہات اور استعارات کا استعمال بھی کر سکتا ہے۔

سلیم اختر کے اسلوب کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ مدلل ہوتا ہے۔ اس حوالے سے مرزا ادیب اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ:

سلیم اختر نئی نسل کا فرد ہے۔ وہ نئی نسل کے بعض کوتاہ فکر ساتھیوں کی طرح جذباتی باغی نہیں۔ روایات سے بغاوت بھی کرتا ہے اور روایات کا احترام بھی کرتا ہے۔ اس نے اردو کے کلاسیکی ادب کے بیشتر دور کا بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس لیے جب بھی وہ کوئی بات کرتا ہے اس میں وزن ہوتا ہے، فکری گہرائی ہوتی ہے، توازن اور اعتدال ہوتا ہے اور خود اعتمادی کا وہ احساس ملتا ہے جو ایک باشعور، دیدہ ور اور ذمہ دار مصنف کا خاصہ ہے۔ ادب کی دنیا کا یہ مسافر ہر دم تازہ دم ہے۔ تیز رو تو یقیناً ہے مگر قدم اٹھانے میں بڑا محتاط ہے۔[۱۵]

سلیم اختر نے ایک نقاد کی حیثیت سے اپنے افسانوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جنسی نفسیاتی کہانیاں، معاشرتی کہانیاں اور استعاراتی علامتی کہانیاں۔ سلیم اختر نے چالیس برس ادبیات اردو کی تدریس کی ہے اس لیے وہ داستانوی زبان لکھنے پر قادر ہیں۔ افسانہ "حاتم طائی کا زوال" میں کہانی کی فضا داستانی اسرار و رموز اور علامتوں پر مبنی ہے۔ کہانی کے آغاز میں صحرا میں گدھ کی زندگی کا منظر پیش کیا گیا ہے۔

اس نے بلندی سے نیچے دیکھا، ریت سمندر، دوپہر کی چمکتی دھوپ، ریت لہروں کو آبی لہروں میں تبدیل کر رہی تھی۔ جی چاہا نیچے اتر کر ان لہروں سے پیاس بجھائے، ڈبکی لگائے لیکن جانتا تھا کہ یہ پانی کی نہیں بلکہ دھوکے کی لہریں ہیں اور سیمابی سمندر محض چمکدار ذرات ہیں۔[۱۶]

درج بالا اقتباس میں دورانِ پرواز گدھ کے مشاہدے کی گہرائی کو مشکل الفاظ کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے لیکن بیان میں وضاحت موجود ہے اور صورت حال واضح طور پر قاری کے سامنے آجاتی ہے کہ گدھ اس سچائی سے بخوبی آگاہ ہے کہ یہ فریبِ نظر ہے پانی نہیں بلکہ سراب ہے۔

اسی طرح افسانہ "پھن پھول" جس کی فضا رومانوی اور غیر مرئی باتوں سے سجی ہوئی ہے۔ اس میں صحرا میں گدھ کی بقا اور انسان کی فنا کا سبب کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

گدھ یہ سب کچھ دیکھتا جا رہا تھا اس کی تجربہ کار آنکھیں ریت کے سمندر میں بدلتے مناظر کی شناسا تھیں۔ ریت سمندر کے جزیرے اور ان ریت جزیروں میں ریت جھیلیں وہ ان سے آگاہ اور ان کی اصلیت جانتا تھا۔ اس لیے وہ کبھی بھی انسان کی مانند سراب کے آسیب کا اسیر نہ ہوا تھا اور غالباً اس لیے انسان کی مانند وہ کبھی بھی ریت سمندر میں ڈوب کر نہیں مرا تھا۔[۱۷]

درج بالا اقتباس میں گدھ کے تجربے کی گہرائی کو مشکل الفاظ اور تراکیب بندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور سراب کی دہشت کو بیان کرنے کے لیے آسیب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے تحریر میں الجھاؤ پیدا ہوتا

ہے لیکن قطعیت بھرپور انداز میں دکھائی دیتی ہے کہ گدھ فریب نظر سے بچ کر بقا حاصل کرتا ہے اور انسان فریب نظر کا شکار ہو کر صحرا میں بھٹک جاتا ہے اور اپنی زندگی سے محروم ہو جاتا ہے۔

سلیم اختر نے نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں نفسیاتی کشمکش اور جنسی ناآسودگی کی جھلک ملتی ہے۔ افسانہ "مس احمد بی۔ اے بی ٹی" کا موضوع نسائی ہم جنسیت ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اس افسانے کے متعلق لکھا ہے: "مس احمد بی۔ اے بی ٹی ان کا شاہکار افسانہ ہے۔"[18]

یہ افسانہ کنواری اُستانیوں، ان کی سہیلیوں اور شاگردوں کے گرد گھومتا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار میں مس احمد بی۔ اے بی ٹی نے مرد کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے لیکن افسانے کے اختتام پر اعصابی پژمردگی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ حواس کی شکست اور تنہائی کا اعلان ہے:

> آئینہ اسے یہ بتاتا ہے کہ تو وقت سے بازی ہار چکی ہے اور یہ ہاری ہوئی مس احمد بی۔ اے بی ٹی خود کو لڑکیوں کے سمندر میں ایک ویران اور بے برگ و بہار جزیرہ محسوس کرتی ہے۔ شریر اور چنچل لہریں آتی تو ہیں مگر واپس جانے کے لیے۔۔۔ جزیرہ پیاسا ہی ہے۔[19]

سلیم اختر نے درج بالا اقتباس میں مس احمد بی۔ اے بی ٹی جو نسائی ہم جنسیت میں مبتلا ہیں اس کی نفسیاتی کشمکش اور دلی جذبات کو مشکل پیرائے میں بیان کیا ہے لیکن قطعیت بھرپور انداز میں موجود ہے جس کی وجہ سے قاری قانون فطرت کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی جنسی تسکین کے لیے پیدا کیا ہے۔ جو لوگ اس سے انحراف کرتے ہوئے وقتی لذت حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان کی جنسی خواہش نامکمل اور ادھوری رہتی ہے اور ان کی شخصیت میں خالی پن پیدا ہو جاتا ہے۔

افسانہ "مٹھائی کی پلیٹ اور دودھ کا گلاس" میں جنسی جذبے کی شدت کو بیان کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر عصمت جمیل:

> سلیم اختر کے افسانوں کا مرد جنس سے تخلیق ہوا ہے۔ مٹھائی کی پلیٹ اور دودھ کا گلاس اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ عورت کے جذبات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اسے عورت کے جذبات کی کوئی پرواہ نہیں۔ اسے عورت کے ذہن کی نہیں جسم کی ضرورت ہے۔[20]

افسانے کا آغاز شادی کی پہلی رات کے منظر سے ہوتا ہے:

> اسے کوئی احساس نہ تھا کہ رات کتنی بیت چکی وہ خود کو سمندر کی تہ میں غرق شدہ کشتی کی مانند محسوس کر رہی تھی۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور ذہن جیسے ابھی تک گرداب میں ہو۔ اس کے

دونوں ہاتھ سینے پر تھے جیسے وہ خود کو کسی نادیدہ حملہ آور کے دست درازی سے محفوظ رکھنے کی خواہاں ہو۔ بال پسینہ میں بھیگے تھے۔ ہونٹ سنگترے کی چوسی ہوئی پھانک محسوس ہو رہے تھے۔ خود کو وہ بری طرح جھنجھوڑی ہوئی ہڈی سے بھی زیادہ بے وقعت سمجھ رہی تھی۔ اسے اپنا جسم ناپاک اور گندگی سے آلودہ جوتی کے تلے جیسا لگ رہا تھا۔ یہ شادی کی پہلی رات تھی اور زرینہ خراٹے لیتے خاوند کے پہلو میں بیدار لیٹی تھی۔[۲۱]

درج بالا اقتباس میں افسانہ نگار نے نو بیاہتا زرینہ کی شادی کی پہلی رات کے ناخوشگوار تجربے کو تشبیہات ،شکستہ کشتی، آلودہ جوتی کے تلے اور استعارے سنگترے کی چوسی ہوئی پھانک ، جھنجھوڑی ہوئی ہڈی کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ تحریر کو پڑھ کر مشکل پسندی محسوس ہوتی ہے لیکن قطعیت کا پہلو بھی واضح دکھائی دیتا ہے۔ جو مرد حضرات بیوی کے جذبات کا خیال رکھے بغیر جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں ان کے درمیان کبھی بھی ذہنی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی طرح افسانہ نگار مزید زرینہ کی جذباتی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

ان کے خاندان کی لڑکیوں میں اور کوئی خوبی ہو یا نہ ہو مگر ان کی شرافت مسلم تھی۔ زرینہ ایک ایسے ساز کی مانند تھی جس کے تاروں سے اکتساب نغمات کے لیے تھوڑی محنت اور صبر کی ضرورت تھی لیکن واجد میں انہی کا فقدان تھا۔ اسی لیے ان میں وہ پیار نہ تھا جس کی بنیاد صحت مند جنسی جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ شادی کے ابتدائی ماہ نئی دلہنوں کے لیے جذباتی سرمستیوں کے ہنڈولے ثابت ہوتے ہیں لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔[۲۲]

درج بالا اقتباس میں افسانہ نگار نے زرینہ کی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لیے اس کی ذات کو "ساز" سے تشبیہ دی ہے۔ اگر ساز کو نرمی سے چھوا جائے تو اس میں سے خوبصورت "سر" پیدا ہو سکتے ہیں۔ تحریر میں مشکل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں لیکن معنی میں سادگی پائی جاتی ہے۔ واجد اپنے بے صبرے پن کی وجہ سے زرینہ میں لطیف جذبات کو نہ جگا سکا۔ اس لیے ان کے درمیان وہ محبت نہ ہو سکی جو ایک صحت مند رشتے کی بنیاد بنتی ہے اور زرینہ کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔

افسانہ "گندہ خون" کا موضوع جاگیر دارانہ نظام ہے۔ مصنف گاؤں کی خوبصورت پر سکون فضا کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :

ہم جیسے بابو جب گاؤں آتے ہیں تو یہاں کا پر سکون ماحول جیسے مہر بہ لب کر دیتا ہے۔ کم از کم میرا تو یہی تجربہ ہے میں شہر کی بے معنی بھاگ دوڑ، مسابقت اور شور بے اماں اعصاب شکن شور سے بھاگ کر یہاں آیا تھا۔ گاؤں پہنچتے ہی جب پُروائی کے ٹھنڈے جھونکوں نے میری پیشانی

کو سہلایا تو ٹوٹتے اعصاب کو پر سکون ہوتے پایا مجھے شہر اور گاؤں میں وہی فرق محسوس ہو رہا تھا
جو سیاہ کافی اور تازہ چھاچھ میں ہوتا ہے۔ [۲۳]

درج بالا اقتباس میں افسانہ نگار نے گاؤں اور شہر کی فضا کا تقابل مشکل الفاظ استعمال کرتے روانی کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے ساتھ بیان میں قطعیت بھی موجود ہے کہ شہر میں بڑھتی ہوئی شور کی آلودگی انسانی اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہی ہے جبکہ گاؤں کی پر سکون فضا اعصابی اطمینان فراہم کرتی ہے۔

افسانہ "جلے پاؤں کی بلی" کا موضوع صنفی تقسیم ہے۔ ہمارا معاشرہ پدر سری نظام کی عکاسی کرتا ہے جس میں مرد کو ہمیشہ عورت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اور ان کی تربیت میں بھی امتیازی سلوک رکھا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت سلیم اختر نے عورت جنس جذبات میں کی ہے۔

بچپن میں جو ماحول ملتا ہے اس میں اسے ہر کام پر اور ہر لحظہ یہ احساس کرایا جاتا ہے کہ صنف نازک یعنی جنس ضعیف ہے۔ اس میں کسی قسم کی انفرادیت نہیں ہوتی۔ ماحول اس قدر صنفی ہے کہ اپنی انفرادیت کو تسلیم کرانے کے لیے وہ مرد کے سہارے کی محتاج ہے۔ [۲۴]

سماج کا یہ رویہ افسانے کے مرکزی کردار "نعیمہ" میں ظاہر ہوتا ہے۔ اہل خانہ کے امتیازی سلوک کی وجہ سے اس میں نفسیاتی الجھن پیدا ہو جاتی ہے کہ معاشرے میں عزت، سکون، آزادی اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے مرد ہونا بہت ضروری ہے۔ افسانہ نگار کالج میں ہونے والے ڈرامہ کی پریکٹس کا منظر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

آئینہ میں تبدیلی ہیئت کا نظارہ کر کے نعیمہ ششدر رہ گئی۔ خود کو ٹریڈ مارک کے بغیر دیکھ کر اس پر عجیب خوشگوار اثر ہوا۔ ڈاڑھی اور پگڑی نے اسے ایک مدبر شخصیت بنا دیا تھا۔ ڈرامہ کیونکہ آخر میں تھا اس لیے وہ ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔ آج اسے وہ دن یاد آ رہا تھا جب اس نے خالی گھر میں پہلی مرتبہ مردانہ لباس زیب تن کیا تھا۔ اس دن وہ کیسے حواس باختہ تھی اور آج کتنی مطمئن۔ [۲۵]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے صنفی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھن کو مشکل الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے بیان کیا ہے اور قطعیت کا عنصر غالب ہے کہ صنفی تقسیم میں مرد کے روپ ہی کو عزت حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے نعیمہ نے نسوانی حسن کے بغیر ایک مرد کے روپ میں دیکھ کر خود کو معتبر محسوس کیا اور وہ آج بہت اطمینان محسوس کر رہی تھی۔

اولاد اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا تحفہ ہے اور ان کی تربیت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ماں باپ پر عائد کی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اچھے اور برے کا فرق بتائیں اور ان کی فطرت کو اخلاقِ حسنہ سے مزین کریں لیکن پدر سری معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ لڑکوں کو شروع ہی سے بے جا لاڈ پیار اور ان کی غلطیوں کو نظر انداز کر کے اُن کی شخصیت اور مزاج کو خراب کر دیا جاتا ہے۔ اس صورتحال کی عکاسی سلیم اختر اپنے اسی افسانے میں کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

> کلیم نے جس دن باپ کو جوتا مارا سارا گھر کھل اُٹھا اور محلہ بھر میں اس شرارت کا تذکرہ کیا گیا۔ اس نے جب پہلی گالی دی تو ماں باپ کا بس نہ چلا ورنہ اس کا منہ موتیوں سے بھر دیتے۔ وہ گھر میں آمر تھا اور چھ بہنوں پر اسے ہر لحاظ سے ترجیح دی جاتی۔ باقی پر تو اس لیے کہ وہ لڑکیاں تھیں اور نعیمہ پر اس لیے کہ وہ کلیم کے بعد آئی تھی۔ کلیم اسے تنگ کرتا اس کی چٹیا کھینچ لیتا، روٹی اُٹھا پھینکتا، مکوں سے پیٹ ڈالتا مگر سارا گھر ہنستا رہتا۔[۲۶]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے صنفی تقسیم کی بنیاد پر قطعیت کا پہلو نمایاں کیا ہے کہ ایک لڑکے کی شخصیت کا بگاڑ اس کے گھر کا ماحول بنتا ہے جس میں اس کی غلطیوں، بد تمیزوں کو شرارت سمجھ کر محبت اور قہقہوں میں ٹال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی ذات میں غرور، انا پسندی اور خود سری جیسے بری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور عورت پر برتری کا احساس اُجاگر ہو جاتا ہے اور پھر معاشرے میں اس کا کردار ایک آمر کی طرح ہو جاتا ہے۔ وہ ہر ایک سے زبردستی کر کے اور اپنا رعب و دبدبہ جمانا اپنا حق سمجھتا ہے۔ اور اس طرح اس کی شخصیت کا ٹیڑھا پن وقت کے ساتھ ساتھ مزید بڑھتا جاتا ہے جو آگے چل کر معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔

افسانہ "کاٹھ کا شہر" جس کا موضوع معاشرتی جبر ہے۔ کہانی کے آغاز میں بادشاہ کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> شاہ اپنے اقتدار کے نصف النہار پر تھا! وہ ہر صبح مثلِ آفتاب بسترِ ناز سے طلوع ہو کر پہلی انگڑائی لیتا تو بازو گویا مشرق تا مغرب پھیل جاتے۔ وہ جب شبستانِ راحت سے پہلا قدم باہر نکالتا تو گویا لرزہ زمین و آسمان کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ وہ جب محلِ سرا میں جانے کو پھولوں سے بھرے راستہ پر بصد ہزار تمکنت گامزن ہوتا تو گویا آسمان جھک کر قدم بوس ہوتا۔ وہ جب شاہی دربار میں مسندِ زر نگار پر کہ تختِ طاؤس جس کے سامنے محض چوب خشک ثابت ہو بعد افتخار سریر آرائے مملکت ہوتا تو ملائک نغمۂ تہنیت گاتے۔[۲۷]

درج بالا اقتباس میں افسانہ نگار نے بادشاہ کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے مشکل الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ تحریر پڑھ کر مشکل پسندی محسوس ہوتی ہے اور بیان میں قطعیت کا عنصر واضح ہے کہ بادشاہ کی حکومت کا رعب و دبدبا سارے عالم میں پھیل چکا ہے۔ اسی طرح افسانہ نگار "کاٹھ کا شہر" کی تکمیل کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

> الغرض برسوں کی محنت اور قارون کے خزائن سے بھی بڑھ کر زرِ کثیر صرف کرنے کے بعد جب یہ نادر روزگار شہر تکمیل کو پہنچا تو جشن کا اعلان کیا گیا۔ دور دور سے خلق یہ یگانۂ دہر شہر دیکھنے آئی۔ تب اختر شناسوں، نجومیوں اور مالوں کی مقرر کردہ سعد ساعت میں شاہ اراکین، عمائدین، رؤسا، شرفا اور لشکر شاہی کاٹھ کے شہر میں، کاٹھ کے مکانوں میں آباد ہو کر زیست کرنے لگے۔ مگر اس بات کا کسی کو علم نہ تھا کہ کاٹھ کا شہر دیمک کی بستی پر تعمیر ہوا تھا۔[۲۸]

درج بالا اقتباس میں افسانہ نگار نے شہر کی تکمیل، شہرت اور اس میں زیست کو بیان کرنے کے لیے مشکل الفاظ کا چناؤ کیا ہے لیکن مفہوم میں سادگی پائی جاتی ہے۔ جس معاشرے میں کمزور کی کوئی حیثیت نہ ہو اور بے حسی کی بنیاد پر رکھی گئی سلطنت ہمیشہ ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے اور دیمک پورے معاشرے اور سلطنت کو کھوکھلا کرنے کا ہنر جانتی ہے۔

افسانہ "کنول کنڈ" کا موضوع جنس ہے افسانے کے آغاز میں بستی کے لوگوں کے مثالی کردار کو بیان کرتے ہوئے افسانہ نگار لکھتا ہے کہ:

> بستی کے باسی بہار کی ہوا جیسے معتدل مزاج تھے۔ بزرگوں کی آنکھوں میں خوردوں کے لیے حسد اور خشونت کی بجائے شفقت ملتی تو چھوٹوں کے اطوار میں ان کے لیے احترام۔ زوجہ میاں کی اور بیٹی باپ کی تابعدار تھی اور شرم و حیا کنواریوں کے زیورات تھے۔ ان کے بال ہوا میں نہ اڑتے تھے نظریں نیچی ہوتیں اور سینے ڈھکے رہتے۔ ان کے ہجر میں شرافت کی مٹھاس اور باتوں میں حیا کی ملائمت ملتی۔ اس لیے کسی عورت، بیوی، بیٹی اور کنواری یا بیوہ نے ریت و رواج کی لکیر پھلانگنے کی کوشش نہ کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج تک کسی کنواری کی نہ تو نظر ٹھٹکی نہ چال بھٹکی نہ جوانی اٹکی اور نہ ہی روح بھٹکی۔[۲۹]

درج بالا اقتباس میں افسانہ نگار نے "کنول کنڈ" بستی کے باسیوں کے مثالی کردار اوصاف کو بیان کرنے کے لیے مشکل الفاظ کا چناؤ کیا ہے۔ لیکن بیان میں قطعیت کا عنصر واضح ہے کہ شرم و حیا ایسی خوبیاں ہیں جو مثالی کردار اور مثالی معاشرے کی بنیاد بنتی ہیں۔

افسانہ "کھجوروں کا موسم" داستانوی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کا موضوع معاشرتی جبر ہے۔اس میں سیاسی شعور اُجاگر کیا گیا ہے اور کھجور کا درخت آمریت کی علامت ہے۔کہانی میں بستی کی ویرانی کو بیان کرتے ہوئے افسانہ نگار کہتا ہے کہ :

> نہ گھنے درختوں کی خنک چھاؤں کوئل کو کتی نہ املتاس کے درختوں پر پیلے پھولوں کے جھومر سجتے، نہ جھاڑیوں کی مہکار میں چڑا چڑیا سے اظہار محبت کرتا، نہ دن کو موتیا مہکتا نہ رات کو رات کی رانی خوشبودار سانس لیتی۔ نہ بن میں مورنی کو رجھانے کے لیے مور رقص کرتا ان سب کو کاٹ کر ان کی جگہ کھجور کے درخت لگا دیے گئے تھے۔[۳۰]

درج بالا اقتباس میں روانی کے ساتھ بستی میں گیت، خوشبو، محبت، رقص کے خاتمے کو بیان کیا ہے۔ تحریر کو پڑھ کر مشکل پسندی کا احساس ہوتا ہے لیکن مفہوم بالکل سادہ اور واضح ہے کہ آمریت میں صرف بادشاہ کا حکم چلتا ہے اور عوام کو آزادی رائے اور خواہش کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اس لیے ہر حال میں بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔

آمریت ایک پر تشدد رویے اور حکومت کا نام ہے جس میں بادشاہ کے اصولوں کے خلاف بغاوت کرنے والے انسان کو ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سلا دیا جاتا ہے کیوں کہ آمریت اپنے خلاف مزاحمت کو قبول نہیں کرتی اور طاقت کے بل بوتے پر انسانوں کے اوپر اپنا تسلط قائم کرتی ہے۔اس صورتحال کو سلیم اختر نے اس افسانے میں اس انداز سے پیش کیا ہے :

> اور پھر ایک دن! وہ دونوں بستی سے باہر کھجوروں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے۔ موضوع وہی ایک تھا یعنی کھجور کا درخت ۔۔۔ وہ حسب معمول زوردار لہجہ میں کھجوروں کی مذمت کر رہا تھا کہ اچانک پہلو کا درخت جھکا اور بیشتر اس کے کہ انہیں احساس ہوتا، درخت کی لمبی لمبی شاخوں نے اسے کسی بچہ کی مانند اپنے بازو میں لے لیا، درخت سیدھا ہوا تو وہ اس کی شاخوں میں گم ہو چکا تھا۔ یہ سب اتنا اچانک تھا کہ اب تک اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ کھجور کا بے ضرر درخت اچانک آدم خور درخت بن گیا۔ اس نے لوگوں سے اس حادثہ کا ذکر کیا تو سب نے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا کوئی اس کی بات نہ سمجھ رہا تھا۔ بند ہونٹوں اور نہ دیکھتی آنکھوں سے سب نے اس کی بات کا استقبال کیا اور تب اسے احساس ہوا کہ وقتاً فوقتاً اس سے بیشتر بھی اس طرح لوگ غائب ہوتے رہے ہیں تو کیا یہ سب کھجور کے درخت کا کھانا بنے؟ کیا انسان اب صرف کھجور کے درخت کی کھاد بننے کے لیے رہ گیا ہے؟ وہ سوچتے سوچتے پاگل ہوا جا رہا تھا اور پھر

ایک دن وہ سچ مچ ہی پاگل ہو گیا۔ اس نے کلہاڑی اٹھائی اور کھجور کے درخت کے تنے پر اپنی پوری دیوانگی کی شدت کے ساتھ ایک کاری ضرب لگائی اور لوگوں کی حیرت سے پھٹی آنکھوں نے دیکھا کہ اس کے دوست کو کھا جانے والا درخت ایک ہی ضرب میں ڈھے گیا۔ اس نے خوشی کا نعرہ لگایا مگر بیشتر اس کے کہ اس کا کھلا منہ بند ہوتا ایک اور درخت اسے اچک چکا تھا۔[۳۱]

اس طویل اقتباس میں سلیم اختر نے آمریت کی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اس حکومت میں بغاوت کرنے والے ہر شخص کو قتل کر دیا جاتا ہے اور معاشرہ کٹھ پتلی کی طرح آنکھیں اور زبان بند کر کے اس ظلم کا تماشا دیکھتا ہے۔ کیوں کہ خوف و ہراس کی وجہ سے کسی میں بھی آواز بلند کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس معاشرتی بے حسی کی وجہ سے بہت سارے لوگ اس ظلم کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جو لوگ سوچ اور فکر رکھتے ہیں وہ اس پر تشدد رویے کو دیکھتے ہوئے اپنے ہوش و حواس سے بیگانے ہو جاتے ہیں اور اپنے پاگل پن کی وجہ سے جب کھلم کھلا مزاحمت کرتے ہوئے آمریت پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ان کو بھی قتل کر دیا جاتا ہے۔ گویا آمریت صاحب نظر انسانوں کا خاتمہ کرتی ہے اور عوام کو اپنے تسلط میں رکھتی ہے۔ یہ اقتباس سیاسی نقطہ نظر سے قطعیت کی عمدہ مثال ہے۔

افسانہ "کاجل بن" سیاہی کا استعارہ ہے۔ اس جنگل میں ہر چیز سیاہ ہے اور اس پر کالے کوؤں کا راج ہے جب یہ کالے کوے روشن بن پر حملہ کرتے ہیں اور تمام جگنوؤں کو کھا جاتے ہیں۔ ان کی واپسی کا منظر افسانہ نگار بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

شاداں و فرحاں چیختے چلاتے انہوں نے واپسی کا سفر طے کیا وہ جلد سے جلد اپنی تاریک عافیت میں پہنچنا چاہتے تھے۔ انہیں باہر کی ہوا، فضا، رنگ، روشنی، نغمہ خوش نہ آتا تھا۔ لہذا فتح کے شور میں مگن اڑے جا رہے تھے اور بالآخر جب اپنے کاجل بن میں جا پہنچے تو مزید چلا چلا کر خوشی اطمینان اور فتح کا اعلان کیا۔ مگر یہ کیا؟

تاریک باطن میں روشنی لیے یہ کوا جگنو بنا چمک رہا تھا۔ کاجل بن جگنو بن میں تبدیل ہو چکا تھا۔[۳۲]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے شر سے خیر تک کے سفر کو روانی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تحریر پڑھ کر مشکل الفاظ کا احساس ہوتا ہے اس کے ساتھ بیان میں وضاحت موجود ہے۔ جب روشنی اور اچھائی تاریک باطن میں

جائے اس کو بھی منور کر دیتی ہے۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے جس کا ذائقہ ہر ذی روح نے چکھنا ہے لیکن کچھ حالات و واقعات اس کو تلخ اور خوفناک بنا دیتے ہیں۔ اسی تلخی کی عکس بندی سلیم اختر نے اپنے افسانہ اور بستی میں کی ہے جس کا موضوع کفن چوری سے لے کر نعش کی بے حرمتی کے گرد گھومتا ہے:

> اور پھر اچانک یہ سلسلہ جس طرح پراسرار طریقہ پر شروع ہوا تھا اسی طرح اس نے پراسرار طریقہ پر نئی کروٹ لی۔ جو پہلے کے مقابلے میں اتنی خوفناک تھی کہ لوگوں کو کفن چور فرشتہ معلوم ہونے لگا کہ صرف کفن چراتا تھا۔ اس نے آج تک نعش کی بے حرمتی نہ کی تھی۔ جب دوشیزہ کے لواحقین اگلی صبح قبرستان پہنچے تو سرہانے دھرا کفن بھی غائب پایا۔ لیکن یہ دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ لاش کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ یہ ناقابل فہم بات تھی کہ بستی کے مرد نے کبھی زندہ عورت کی بے حرمتی نہ کی تھی چہ جائیکہ لاش کی بے حرمتی! اس انداز کی یہ پہلی مثال تھی مگر آخری نہیں۔ [۳۳]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے ایک مثالی بستی کا منظر پیش کیا ہے جس میں پیار راج کرتا تھا اور عورت کی عزت کی جاتی تھی اور دنیائے فانی سے رخصت ہونے والے مرحومین سے محبت کی جاتی تھی۔ اس منظر کشی کے دوران سلیم اختر نے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کو پیش کیا ہے کہ پہلے تو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے مردوں کے کفن چرائے جاتے تھے لیکن اب جنسی آگ بجھانے کے لیے مردہ عورتوں کی بے حرمتی کی جانے لگی ہے۔ یہ اس بھیانک سفر کا آغاز ہے اور نہ ختم ہونے والے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس منظر کشی سے سلیم اختر نے انسانوں کے اوپر اس بات کو واضح کیا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین تخلیق کا روپ عطا کیا لیکن وہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے بدترین حالت کی طرف لوٹ گیا ہے اور مردہ عورتوں کی بے حرمتی ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے جس کی مثالیں موجود دور میں بھی موجود ہیں۔ سلیم اختر نے واضح انداز میں انسانی پستی اور موجودہ دور کی بداخلاقی کا نوحہ بیان کیا ہے۔ یہ اقتباس قطعیت کا رنگ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

انسان جب سے اس دنیا میں پیدا ہوا ہے آگے بڑھنے کی خواہش نے اسے ہمیشہ محو سفر رکھا ہے۔ اپنی خواہش کی جستجو اور لگن کی وجہ سے انسان ترقی کرتا ہوا جدت کی انتہا کو پہنچ گیا ہے جس نے انسانی زندگی کو راحت، سکون، رنگا رنگ روشنیوں سے منور کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہی ترقی انسان کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہے جس نے انسان کی زندگی کو بہت ساری مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ سلیم اختر افسانہ "آخری کھونٹ" جس کی کہانی

داستانوی انداز میں لکھی ہے روشنی کے اس سفر کی وحشت اور خوفناکی کو بیان کرتے ہیں:

> روشنی پاکر ہم بچوں کی مانند خوش تھے۔ان چند کے علاوہ جو روشنی کی حقیقت جانتے تھے اور تاریکی کے فوائد سے بھی آگاہ تھے۔ جب کہ باقی سب روشنی کو کھلونا بنا کر اس سے کھیل رہے تھے اور پھر۔۔۔ پھر وہی ہوا جو پرکھوں نے بتایا تھا۔ روشنی نے ہم سب کو ننگا کر دیا۔ پہلے ہمیں دوسرے ننگے نظر آئے۔ خیر اس میں تو کوئی حرج نہ تھا لیکن پھر یہ ہوا کہ ہم سب اپنے آپ کو بھی ننگا دیکھنے لگے۔ پس زندگی وحشت ناک خواب میں تبدیل ہو گئی۔ جیسے جیسے روشنی بڑھتی گئی، وحشت میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور جیسے جیسے وحشت بڑھتی گئی ہمارا ننگ بھی بڑھتا گیا اور جیسے جیسے ہمارا ننگ بڑھتا گیا ہم خونخوار ہوتے گئے حتی کہ ہم سے ڈر کر جانوروں نے بستی چھوڑ دی۔ کتے تک بھی گھروں سے رخصت ہو گئے۔[۳۴]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ہمارے آباؤاجداد جو ماضی پرست تھے اور نئی تہذیب کے ابھرتے ہوئے تصور اور ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھتے ہوئے انسان کے اس روشنی کے سفر کے نقصانات سے آگاہ تھے۔ ان کے تمام خدشات بالکل درست ثابت ہوئے ہیں کہ نئی تہذیب اور خود آگاہی کے اس سفر نے انسان کو تہذیب یافتہ بنانے کی بجائے ایک دوسرے کے سامنے ننگا کر دیا ہے جس کی وجہ سے انسان کی زندگی خوبصورت بننے کی بجائے خوفناک رنگ اختیار کر گئی ہے اور جتنا آگاہی کا سفر آگے کی طرف بڑھ رہا ہے انسان اتنا ہی وحشی ہوتا جا رہا ہے کہ زمین کے جانور بھی اس سے پناہ مانگ کر دور ہو رہے ہیں۔ دراصل سلیم اختر نئی تہذیب کی آڑ میں معاشرے کی شکست وریخت کو بیان کر رہے ہیں کہ انسان نے اس دوڑ میں جہاں خود کو نقصان پہنچایا ہے وہاں فطرت کے حسین مناظر کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

اگر انسان میں آگے بڑھنے کا جذبہ بیدار ہو جائے تو راستے خود بخود اس کے لیے آسان ہو جاتے ہیں۔ اس صورتحال کو سلیم اختر نے اس افسانے میں کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے:

> جیسے جیسے ہم خواب دیکھتے گئے اور روشنی روشنی پکارتے گئے، ویسے ویسے ہی سر پر سے تاریکی کی چادر سرکتی گئی، بستی پر سے سایوں کی چھت ہٹتی گئی جیسے جیسے سورج کی روشنی میں اضافہ ہوتا گیا جالے مرجھا کر نیچے گرتے گئے اور مردہ مکڑیوں کے ڈھیر لگ گئے۔[۳۵]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جب انسان میں کوشش اور اپنے حالات کو بدلنے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو قدرت خود بخود راستہ ہموار کر دیتی ہے کیوں کہ یہ قانون فطرت ہے کہ خدا اسی قوم

کی حالت کو بدلتا ہے جو اپنی حالت بدلنے کی کوشش کرتی ہے اور انسان کو وہی ملے گا جس کے لیے وہ تگ ودو کرتا ہے کیوں کہ نیکی اور خود آگاہی کا سفر ہمیشہ دشوار اور کٹھن ہوتا ہے لیکن انسان کی کوشش اس کو جہالت اور برائی سے نجات دلا سکتی ہے۔ جو لوگ سچائی کو جانتے ہیں اور دوسروں کو بھی سچائی کا راستہ دکھاتے ہیں معاشرہ ہمیشہ ان کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ اس صورتحال کو سلیم اختر اس افسانے میں اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

> تب اچانک ہماری روشنی ہمارے ننگ اور ہماری وحشت نے اس مسافر کو جالیا کہ یہی باعث فساد تھا اسی نے روشنی کا خواب دیا تھا اور اسی نے ہمیں روشنی کی بھیانک تعبیر کے عذاب میں گرفتار کیا تھا۔ وہ اس مقام پر تھا اسے معلوم ہو چکا تھا کہ روشنی میں نہائی تمام بستی اس کی دشمن بن چکی ہے مگر اس نے فرار کی کوشش نہ کی۔ تمام بستی ہاتھوں میں پتھر لیے اس کے سامنے تھی مگر اس کی مسکراہٹ خوف میں تبدیل نہ ہوئی۔ وہ کہنے لگا تم مجھے مار نہیں سکتے کہ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے ہو اور بیشتر اس کے کہ اس پر پہلا پتھر پڑتا، وہ خود ہی پتھر ہو چکا تھا۔ تب سب خوفزدہ ہو کر بھاگے کہ یقینا یہ روشنی کی بلا تھی۔[۳۶]

یہ اقتباس داستانوی رنگ لیے ہوئے ہے لیکن اس میں قطعیت کا پہلو نمایاں ہے۔ سلیم اختر معاشرے کی اس سچائی کو بیان کرتے ہیں کہ جب کسی معاشرے میں انقلابی شخصیت پیدا ہوتی ہے اور اپنے افکار و نظریات کے ذریعے معاشرے میں انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے تو معاشرہ اس جرم کی وجہ سے اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے اور اس کو قتل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ سچائی چھپانے سے چھپ نہیں سکتی اور مٹانے سے مٹ نہیں سکتی کیوں کہ سچائی معاشرے میں سرائیت کر جاتی ہے اور اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے اور انقلاب برپا کرنے والا شخص معاشرے کی ستم ظریفیوں کو برداشت کرتے ہوئے ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے اور اس کی یہی امریت اس کے راستے میں رکاوٹ بننے والے تمام افراد کو خوف میں مبتلا کر دیتی ہے۔

سائنس نے انسان کے اندر غور و فکر کا جذبہ پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول میں ہونے والی تبدیلیوں پر غور کرے اور ان کی حقیقت کو دریافت کرے۔ سلیم اختر اس افسانے میں سائنسی نظریے کی حقیقت کو بیان کرتے ہیں: "وہ سال خوردہ اندھا تھا مگر دور سے ہی بولا کون ہے؟ شوکتی ہوائیں اس کی آواز سیاہ پتھروں میں لے گئیں اور پھر پتھر پوچھنے لگے کون ہے؟ کون ہے؟ کون ہے؟"[۳۷]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے سائنسی نظریے کی صداقت کو بیان کیا ہے جس سے قطعیت کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ سائنس کے مطابق جب انسان بلند آواز میں بات کرتے ہیں تو ان کی آواز ماحول میں موجود ارد گرد کی

چیزوں سے ٹکرا کر واپس سنائی دیتی ہے جس سے گونج پیدا ہوتی ہے اور لفظوں کی تکرار سنائی دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پانی کے ساتھ تخلیق کیا ہے اور پانی کو انسان کی زندگی کا لازمی جزو قرار دیا ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ کائنات میں موجود ہر شے، چرند، پرند، حشرات اور پیڑ کی زندگی کے لیے پانی ضروری ہے۔ اگر پانی کی قلت ہو جائے تو زمین میں موجود ہر شے کی خوبصورتی اور رونق ختم ہو جاتی ہے۔ سلیم اختر کا افسانہ "عذاب میں گرفتار بستی" کا موضوع گرمی کی شدت سے پیدا ہونے والی پانی کی قلت ہے۔ سلیم اختر اس افسانے میں گرمی اور پانی کی قلت سے پیدا ہونے والی اذیت کی منظر کشی اس انداز میں کرتے ہیں:

> گرمی نے پہلے بچوں کے گالوں سے شادابی چوسی، پھر دوشیزاؤں کے ہونٹوں سے سرخی، پھر بوڑھوں کی آنکھوں سے طمانیت، پھر کھیتوں کا ہرا جوبن، کنویں کا پانی نیچے اترتے اترتے پاتال تک جا پہنچا۔ پہلے اس میں جھانکتے اپنا منہ نظر آتا تھا پھر پانی تارا بن گیا اور پھر خاک رہ گئی، جوہڑ کے پہلے کنارے سوکھے پھر وہ خود اور اب وہاں بگولے رقص کرتے تھے فصلوں کے پہلے ہرے پات سوکھے پھر ڈنٹھل اور آخر میں زمین کے سینہ میں اتری جڑیں۔ زمین کانچ کے ٹکڑے کی طرح چیخ گئی، تڑک گئی! [۳۸]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ گرمی کی شدت بچوں، جوانوں، بوڑھوں، کھیتوں، کنوؤں غرض زمین میں موجود ہر شے کو متاثر کرتی ہے اور انسانوں کے لیے کمزوری اور بے سکونی اور زمین میں قحط سالی اور پانی کی قلت کا باعث بنتی ہے۔ کیوں کہ پانی زندگی ہے اور زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ پانی کی وجہ سے ہر شے میں زندگی، رونق اور شادابی ہے۔ اگر پانی ختم ہو جائے تو زمین میں زندہ رہنے کے آثار بھی ختم ہو جائیں گے اور زمین بنجر اور ویران ہو جائے گی۔ سلیم اختر نے پانی کی قلت کے لیے "تارا" کا استعارہ اور خشکی کی وجہ سے زمین میں پڑی دراڑ کو کانچ کے ٹکڑے سے تشبیہ دے کر کلام میں خوبصورتی پیدا کی ہے۔ اس کے ساتھ قحط سالی اور پانی کی قلت کو بیان کر کے قطعیت کو عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔

بھوک اور پانی کی قلت دنیا کا ایک ایسا مسئلہ ہے جو انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔ انسان میں ادب و احترام اور لحاظ کا خاتمہ کر دیتا ہے اور انسان میں جوان اور بوڑھے کا فرق ختم کر دیتا ہے۔ ہر ذی روح اپنی حیات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہوتی ہے۔ اس کے لیے اس کو کسی بھی حد سے گزرنا پڑ جائے اس میں اسے کوئی عار محسوس نہیں ہوتی ہے اور اس جنگ میں ہمیشہ طاقت ور بازی لے جاتا ہے۔ اس صورتحال کو سلیم اختر اس افسانے میں کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

بستی کے سب لوگ تاروں کی لو میں برتن اٹھا کر پانی کی تلاش میں نکل جاتے۔ کئی میل پر ایک چھوٹی سی ندی تھی۔ اب وہاں دن رات پانی کا میلا لگا رہتا تھا۔ ہر شخص دوسروں سے پہلے اپنے بہت سے برتنوں کو بھرنا چاہتا تھا جس کے نتیجہ میں عام دستور کے عین مطابق سب سے زیادہ طاقتور سب سے پہلے اور سب سے زیادہ پانی لے جاتا تھا۔ جن لڑکیوں کے ایک پھل مانگنے پر سارا باغ ان کے حوالے کیا جا سکے اب انہیں دھکیل کر پیچھے کر دیا جاتا اور وہ بھی شرمانے بجانے یا گا گر میں منہ دیکر رونے کے بجائے جنگلی بلیوں کی طرح غراتیں۔ وہ بوڑھیاں جنہیں دادی اور نانی اماں کا احترام ملنا چاہیے تھا اس بھیڑ میں پاؤں تلے آ جاتیں تو ٹوٹے گھڑوں کے ٹکڑوں کی طرح کوئی انہیں اٹھانے کو نہ جھکتا۔[۳۹]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے پانی کی قلت سے پیدا ہونے والے مسائل کو پیش کیا۔ ایسے حالات میں ہمیشہ طاقت ور سب سے زیادہ اور سب سے پہلے پانی کا حصول کرتا ہے کیوں کہ طاقت ہر چیز پر غالب آ جاتی ہے۔ یہ ایسا المیہ ہے جس میں انسان جوانی کی رعنائیوں کو بھول جاتا ہے اور وحشی پن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بوڑھے افراد جو پانی کی جنگ میں شامل ہوتے ہیں افراتفری میں کچلے جاتے ہیں اور مارے جاتے ہیں اور کوئی بھی ان کی مدد نہیں کرتا کیوں کہ پیٹ کی آگ انسان میں محبت، رحمت اور ہمدردی کے جذبے کو ختم کر دیتی ہے۔ سلیم اختر نے جوان لڑکیوں کے غصہ کو جنگلی بلی کے غرانے کے ساتھ تشبیہ دے کر اور بوڑھی عورتوں کے کچلے جانے کو گھڑوں کے ٹکڑوں کے ساتھ تشبیہ دے کر کلام میں مشکل پسندی کے ساتھ خوبصورتی بھی پیدا کی ہے۔ اس کے ساتھ پانی کی قلت سے پیدا ہونے والی تگ و دو اور افراتفری کو قطعیت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔

پانی زندگی ہے۔ اگر انسانوں کو پانی کی قلت کا سامنا ہو جائے تو انسان میں زندگی کے خاتمے کے ساتھ ساتھ خواہشوں، جذبوں اور خلوص کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس صورتحال کی سلیم اختر نے اس افسانے میں اس طرح منظر کشی کی ہے:

جن باکرہ لڑکیوں کے پسینوں سے خواہش کی بو آتی تھی اب ان کے گندے جسموں اور بالوں سے بساندھ آتی تھی کہ بات کرنے کو جی نہ چاہے۔ چوری چھپے ملنے والے جوڑے گرمی میں جھلسے پیڑوں کے نیچے ملتے تو ہاتھوں میں ہاتھ دے کر یا ساتھ چپک کر بیٹھنے کے بجائے پرے پرے بیٹھتے۔ خالی اور ویران آنکھوں سے افق کو دیکھتے رہتے جہاں گرد نے مٹیالی چادر تان رکھی ہوتی۔ جسموں سے پانی کم ہوا تو عورتوں کے ہونٹوں کی تر مٹھاس ختم ہو گئی، بیویوں کے جسموں سے شہوت کا پسینہ سوکھ گیا اور ماؤں کی دودھ بھری چھاتیوں سے دودھ اتر گیا۔

مردوں کا مائع حیات نہ رہا چنانچہ اب میاں بیوی الگ الگ چارپائیوں پر لیٹے ان دنوں کو یاد کرتے جب وہ اکٹھے لیٹ سکتے تھے۔[۴۰]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے مشکل الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن پانی کی قلت کی وجہ سے انسان کی جذباتی زندگی کے متاثر ہونے کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ محبت، ملنے اور خواہش کے جذبے ہی انسان کو ایک دوسرے کے قریب کرتے ہیں لیکن پانی کی قلت ان جذبوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ کنواری لڑکیاں جو جذبات کو متحرک کرنے کا باعث بنتی تھیں ان سے گفتگو کرنے کا دل نہیں چاہتا اور عاشق ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے دور ہو کر بیٹھتے ہیں۔ عورتوں کے جسموں سے جوانی کی خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے اور بیویوں کے اندر جنسی خواہش ختم ہونے کے ساتھ ساتھ ماؤں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے اسی طرح مردوں کے اندر وظیفہ زوجیت کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور میاں بیوی حسرت کے ساتھ قربت کے لمحوں کو یاد کرتے ہیں۔ سلیم اختر نے اس اقتباس میں جذباتی زندگی کے متاثر ہونے کی کیفیت اور وجوہات کو قطعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو مختلف نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہ اس کی قدرت ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمت ایک جگہ خوشی، راحت، سکون اور زندگی کا باعث بنتی ہے تو دوسری طرف وہی نعمت تکلیف، پریشانی اور مصیبت کا سبب بنتی ہے اس صورتحال کو سلیم اختر اس افسانے میں اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

> اچھا تو سمندر میں بہت پانی ہوتا ہے۔ ایک نوجوان اچانک جھرجھری لیتا۔ پانی ! وہ آہ بھر کر کہتا اتنا کہ اندازہ بھی نہ کیا جا سکے۔ میلوں کے حساب سے سینکڑوں میلوں کے حساب سے۔ نہ جانے اتنا پانی دیکھ کر کیا حال ہوتا ہو گا۔ ڈر لگتا ہے۔ ڈر وہ ہنستے، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھلا پانی سے بھی کوئی ڈر سکتا ہے۔ ڈر اور وہ بھی پانی سے ناممکن ناممکن۔ یہ بات نہیں مانی جا سکتی۔ پانی تو زندگی ہے۔ اس نے رک کر اپنے ہونٹوں پر یوں زبان پھیری گویا پانی کا ذائقہ محسوس کر رہا ہے۔" پانی خوف نہیں پانی تو زندگی ہے۔ یہاں ہے۔ پھر وہ آہ بھر کر جواب دیتا۔ وہاں نہیں کیوں؟ وہاں پانی کی موت ہے۔ جہاز نگل جاتا ہے۔ خشکی پر چڑھ دوڑے تو بستی کی بستی ہڑپ کر جاتا ہے۔[۴۱]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے خشکی اور تری پر پانی کی موجودگی اور اس کی اہمیت کو واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ خشکی پر پانی زندگی کی نوید ہے۔ انسان کی حیات کا ذریعہ ہے لیکن یہی پانی سمندر کی صورت میں جب بہت زیادہ مقدار میں ہوتا ہے تو زندگی کے بجائے موت کا پیغام بن جاتا ہے۔ ہر شے کو اپنے اندر ڈبو کر غرق کر دیتا ہے۔

اور اگر یہی پانی آبادی کا رخ کرے تو علاقوں کو تباہ و برباد کر کے ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سلا دے۔ سلیم اختر نے اس اقتباس میں قطعیت کے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے کثرت اور قلت کے فوائد اور نقصانات بیان کیے ہیں۔ بے شک پانی کی زیادتی موت کا باعث ہے۔

ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے حکومت ملے لیکن تخت نشینی کا تعلق فہم و فراست کی بہ نسبت مقدر سے جڑا ہوا ہے۔ سلیم اختر کا افسانہ "ظلِ ہما" ایک دلچسپ افسانہ ہے جس کی کہانی ایک کند ذہن شخص کے گرد گھومتی۔ اکثر اوقات ایسے ہوتا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کو حکومت مل جائے تو اپنے فیصلوں سے سب کو حیران کر دیتے ہیں۔ اس افسانے میں سلیم اختر نے ظلِ ہما کے تصور اور مقدر کی عنایت کو بیان کیا ہے:

> کل طلوع آفتاب سے حسب قاعدہ ہما اڑایا جائے گا اور وہ جس کے سر پر بیٹھ گیا وہی ہمارے لیے شہنشاہ معظم ہوں گے کہ وہ ظلِ ہما ہوں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ شاہی کا تعلق بازو کی قوت، دماغ کی عقل اور قلب کی نیکی سے نہیں بلکہ صرف اور صرف مقدر سے ہے۔[۴۲]

اس اقتباس میں سلیم اختر دو معاشرتی رویوں کی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ اول معاشرہ میں "ہما" بادشاہت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہما ایک فرضی پرندہ ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اس کا سایہ اگر کسی بھی انسان کے سر پر پڑ جائے تو اس کو حکومت ملتی ہے۔ دوم معاشرے میں یہ سوچ عام ہے کہ بادشاہت اور حکومت کا تعلق قسمت سے ہے کیونکہ بادشاہی کے لیے عقل، نیکی اور قوت جیسی صفات ہونا ضروری نہیں بلکہ قسمت کا تیز ہونا ضروری ہے سلیم اختر اس اقتباس میں قطعیت کا پہلو نمایاں کرتے ہوئے دراصل معاشرے کے زوال کا سبب بیان کر رہے ہیں۔ یہی سوچ اور من گھڑت قصے انسان کو عمل اور جدوجہد کے جذبے سے عاری کر دیتے ہیں اور انسان خیالی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے۔

طاقت اور قوت انسان کو سلیقہ سکھا دیتی ہیں اور اس کی خامیوں کو خوبیوں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس افسانے میں سلیم اختر نے اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

> رسم تاج پوشی کے بعد ہی اس کے انداز و اطوار میں انقلابی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ ایک طرف جھکاؤ کھانے والے کندھوں میں اکڑاؤ پیدا ہو گیا۔ گدوں بھری چندھی آنکھوں میں روشنی بھر گئی یوں کہ آنکھ ملا کر بات کرتا تو ان میں عجب بجلی کوندتی محسوس ہوتی۔ چنانچہ مخاطب نظروں کی تاب نہ لا کر آنکھیں جھکانے پر مجبور ہو جاتا اور تو اور اس کی رالیں بہنی بند ہو گئی اب اسے کیونکہ بادشاہت مل چکی تھی اس لیے گڑ کی بھی ضرورت نہ رہی تھی۔ ظل ہما زندہ باد!

انداز میں تمکنت، اطوار میں شائستگی، چال میں وقار، گردن میں شاہانہ تناؤ، بشرہ پر ذہانت، گفتگو میں متانت، فیصلوں میں دانائی، الغرض وہ بے حد کامیاب بادشاہ ثابت ہو رہا تھا۔[۴۳]

اس اقتباس میں سلیم اختر اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ اقتدار ایک ایسی قوت ہے جو کند ذہن اور احمق انسان کی شخصیت میں نکھار پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی شخصیت کو رعب و دبدبہ عطا کر دیتی ہے۔ وہ اپنی تمام خامیوں سے پیچھا چھڑا لیتا ہے اور اس کی شخصیت میں وقار، گفتگو میں سنجیدگی اور فیصلوں میں حکمت نظر آتی ہے۔ مثل مشہور ہے جس کے گھر دانے اس کے کملے بھی سیانے۔ بالکل اسی طرح قوت اور اہمیت انسان کو عقل مند بنا دیتی ہے۔ سلیم اختر نے اس اقتباس میں قطعیت کے پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے طاقت اور قوت کی اثر انگیزی کو بیان کیا ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو فہم و فراست کی صفت عطا کی ہے جس کا اظہار مختلف مواقعوں پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات جن لوگوں کو معاشرہ کند ذہن تصور کرتا ہے ان سے ایسے فیصلے صادر ہو جاتے ہیں جو دنیا کو حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس صورت کو سلیم اختر نے افسانہ "ظل ہما" میں اس انداز میں پیش کیا ہے:

چنانچہ بادشاہ بھی اپنی کوششوں میں لگا رہا حتیٰ ایک رازدار خواجہ سرا کی مخبری سے اسے یہ علم ہو گیا کہ ہما کہاں پوشیدہ ہے۔ تب بادشاہ نے جشن شاہی کا اہتمام کیا اور شاہانہ ضیافت کے بعد دربار عام میں اپنے سب سے بڑے بیٹے کو ولی عہد مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔ ارا کین مملکت یہ اعلان سن کر ششدر رہ گئے۔ عمائدین سلطنت نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا غالبا انہوں نے درست نہ سنا تھا۔ مقربان خاص کی زبانیں گنگ تھیں جب کہ دربار کے رتنوں کے چہروں سے پریشانی ہویدا تھی۔ تب وزیر باتدبیر اٹھا۔ تخت شاہی کے پایہ کو بوسا دیا اور بادشاہ کو یاد دلایا کہ ایسا ہونا آئین مملکت کے منافی اور ملکی روایات کے برعکس ہے۔ ہما کی موجودگی میں کوئی شخص خواہ وہ بادشاہ وقت ہی کیوں نہ ہو اس فیصلے کا مجاز نہیں کہ تخت پر کس کا قبضہ ہو گا کہ خود بادشاہ بھی تو ظل ہما ہی ہے۔ اس کلام پر بادشاہ کی آنکھوں میں بجلی چمکی کیسا ہما؟ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ اسے تو کل رات میں کھا چکا۔ جب وزیر بے تدبیر، چند احمق عمائد اور ایک آدھ رکن سلطنت کے سر قلم ہوتے دیکھے تو سب نے بادشاہ کے ساتھ ولی عہد کی جے جے کی تب بادشاہ نے جشن عام کا اعلان کر دیا۔ خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے اور سلطنت کی حدود میں سات دن اور سات رات جشن منایا گیا۔[۴۴]

اس طویل اقتباس میں سلیم اختر نے دلچسپ انداز میں قطعیت کے پہلو کو نمایاں کیا ہے اور معاشرے کی

حقیقت کو بیان کیا ہے کہ بعض اوقات بے ضرر، کند ذہن اور اپنے حلیے سے احمق دکھائی دینے والے انسان جب اقتدار سنبھالتے ہیں تو اپنے فیصلوں کے ذریعے دنیا کو حیران کر دیتے ہیں اور روایت شکن کہلاتے ہیں۔ روایت کی پیروی کرنے والی عوام کی سوچ کو بدل دیتے ہیں اور اپنے فیصلوں سے سیاسی انقلاب برپا کر دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس عمدہ انداز سے فیصلے صادر کرتے ہیں کہ کوئی انسان ان کے سامنے سر اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتا اور ہر طرف ان کی فتح کے نعرے اور خوشی دکھائی دیتی ہے۔ اس اقتباس میں سلیم اختر نے سیاسی بصیرت کو بیان کیا ہے اور عوام کو پیغام دیا ہے کہ سیاسی سطح پر رائج من گھڑت باتوں کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی فہم و فراست کو استعمال کرتے ہوئے ان سے نجات حاصل کی جائے۔

اللہ تعالٰی نے انسان کو جب تخلیق کیا تو اس میں نیکی اور شر دونوں قوتوں کو پیدا کیا۔ کچھ لوگ کھلم کھلا برائی کر کے معاشرے میں انتشار پھیلاتے ہیں اور بعض لوگ اپنی برائی پر نیکی کا لبادہ اوڑھ کر معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹتے ہیں۔ سلیم اختر کا افسانہ " شاہی دستر خوان " ایک ایسے بادشاہ کی کہانی ہے جو بظاہر بہت نیک اور مہمان نواز ہے لیکن اس کی حقیقت ان خوبیوں کے برعکس ہے:

> ایک رات بعام سے فراغت پا کر اور سفر کی کہانیاں سنا کر اور ے تاب سے مدہوش ہو کر جب تازہ وارد مسافر مہمان خانہ میں سو گیا تو نئے خواجہ سرا نے دست بستہ عرض کی حضور کیا بات ہے۔ کمرہ پھر بھر گیا ہے۔ اتنی جلدی؟ بادشاہ نے چونک کر پوچھا حضور ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ چلو جب خواجہ سرا نے تالہ کھولا تو بادشاہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا کہ اتنا بڑا کمرہ واقعی اٹا پڑا تھا یوں کہ چھوٹی انگلی رکھنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ حضور؟ خواجہ سرا نے پوچھا، آج والے مسافر کا کیا کریں گے کرنا کیا ہے۔ نیا کمرہ شروع کرا دو۔ اس نے دانت میں خلال کرتے ہوئے سوچا۔ اتنے بہت سے کمرے اتنی جلدی بھر گئے؟
>
> کمال ہے![۴۵]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے مشکل الفاظ اور مبہم انداز اپناتے ہوئے کلام میں مشکل پسندی پیدا کی ہے لیکن حقیقت بالکل واضح ہے کہ بعض اوقات بادشاہوں کی کرم فرمائی اور مہربانی میں ظلم چھپے ہوتے ہیں اور لوگ ان کی مہربانی اور رحم دلی کی جال میں پھنس کر اپنی قیمتی جان گنوا بیٹھتے ہیں اور بادشاہ کے اس ظلم سے آگاہی بہت دیر بعد حاصل ہوتی ہے۔ دراصل بادشاہ آدم خور ہے اور شاہی دستر خوان کی دعوت مہمان ہی بنتے ہیں۔ بادشاہ اپنی

رحم دلی کے ذریعے لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا کر اپنی خواہش کی تکمیل کرتا ہے۔ اس اقتباس میں قطعیت کا پہلو نمایاں ہے۔ بعض اوقات نیکی کے روپ میں شیطانیت پوشیدہ ہوتی ہے۔

جادو ایک گناہ کبیرہ ہے اور شرک کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کے ذریعے لوگ انسانوں کو ناحق تکلیف پہنچاتے اور اپنی دشمنی، عداوت اور حسد کی وجہ سے انسانوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور ان کو مختلف بیماریوں، تکلیفوں اور مصیبتوں سے دوچار کر دیتے ہیں۔

افسانہ "سائے کی طرح ساتھ پھریں" کے مرکزی کردار پر نادیدہ مخلوقات کا سایہ ہے۔ اس کی ماں اس کو علاج کے لیے پیروں، فقیروں کے پاس لے جاتی ہے۔ اس صورتحال کی منظر کشی سلیم اختر اس انداز سے کرتے ہیں:

> حبس اور بدبو بھری فضا میں سانس لیتی دشوار، پسینے سے چپچپاتا جسم، عامل بتا رہا تھا۔ کالے علم میں تن کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اس کے ہاتھوں پر سیاہ رگوں کا جال تھا۔ ناخن بڑھ کر یوں مڑے کہ گدھ کے پنجہ میں تبدیل ہو گئے۔ آواز میں صدیوں پرانے اندھے کنوئیں کی باز گشت اگر دشمن کو بال مل جائیں، ناخن مل جائیں، کپڑے مل جائیں تو ان پر عمل کر کے وہ تباہ کر سکتا ہے۔[۴۶]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے مشکل الفاظ کا استعمال کر کے عامل کے آستانہ کی منظر نگاری کی ہے۔ اس کے ساتھ حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ دشمن کو انسان کے بال، ناخن اور کپڑے مل جائیں تو وہ ان پر جادو کروا کر انسان کو برباد کر سکتا ہے۔ جادو کی اس حقیقت کا ثبوت احادیث میں بھی ہے کہ ہمارے پیارے نبی کے بالوں پر جادو کروایا گیا تھا۔ سلیم اختر نے جادو کے ذرائع بیان کر کے قطعیت کا پہلو نمایاں کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے نظام کو توازن میں لانے کے لیے ہر قسم کی چھوٹی بڑی مخلوق تخلیق کی ہے۔ ان کو مختلف قسم کی خوبیاں دے کر ایک دوسرے سے ممتاز کیا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے دشمن سے مقابلہ کر سکیں۔ سلیم اختر افسانہ "آشوب چشم" کے آغاز میں مکھی کی خصوصیات اس طرح بیان کرتے ہیں:

> مکھی کی بظاہر دو آنکھیں نظر آتی ہیں لیکن یہ دو آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی آنکھوں کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں مختلف زاویوں سے بڑی آنکھوں میں لگی ہوتی ہیں اور ان ہی کی بدولت مکھی آگے پیچھے دائیں بائیں چاروں طرف دیکھ سکتی ہے اور یوں اپنے نادیدہ دشمن سے محفوظ رہتی ہے۔"[۴۷]

سلیم اختر نے اس اقتباس میں مکھی جو بہت چھوٹی سی مخلوق ہے اس کی جزئیات نگاری بیان کرتے ہوئے اس کی آنکھوں کی ساخت اور نگاہ کی تیزی کو بیان کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں کو اس طرح تخلیق کیا ہے کہ مکھی ایک ہی وقت میں چاروں اطراف میں آسانی سے دیکھ سکتی ہے۔ نگاہ کی تیزی کی وجہ سے اس میں پھرتی ہوتی ہے اور دشمن کے حملے سے بچ جاتی ہے۔ سلیم اختر نے مکھی کی آنکھوں کی ساخت کو بیان کر کے قطعیت کے پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا تو اس کے ساتھ کچھ حقوق و فرائض بھی اس پر عائد کیے جس طرح ایک انسان پر حقوق اللہ اور حقوق العباد فرض ہیں ۔اسی طرح اپنی جان کی حفاظت کرنا اور اس کے سکون و راحت کا خیال رکھنا بھی انسان پر فرض ہے کیوں کہ یہ جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔

سلیم اختر نے اپنے افسانہ " پیر تسمہ پا " جس کی کہانی حاتم طائی کے گرد گھومتی ہے۔اس میں اس صورتحال کو بیان کرتے ہیں:

> ندی کا پانی تھا اور شاید نزدیک میں کوئی بستی بھی ہو، تو کیوں نہ ایک کٹیا بنا کر آرام کرے۔ خوب سو کر جنم جنم کی تھکن دور کرے۔ دوسروں کی خدمت میں جی جان گنوائے اب ذرا اپنے جسم کے احکام بھی تو بجالاؤں اور جسم کا پہلا حکم یہ تھا کہ آرام کرو، جسم چلائے بغیر حالت / سکون میں رہو۔[۴۸]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے حاتم طائی جس نے اپنی تمام عمر دوسروں کی خدمت کرنے میں گزار دی کے ذریعے انسانی جسم کے حق کو بیان کیا ہے۔ اور اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جس طرح انسان پر دوسروں کی خدمت کرنا اور ان کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرنا فرض ہے اسی طرح اپنی جان اور جسم کو سکون اور آرام دینا بھی انسان پر لازم ہے۔ انسان کے جسم کا اس پر یہ حق ہے کہ اس کی راحت اور سکون کا خیال رکھا جائے۔ سلیم اختر نے مشکل الفاظ کے ذریعے اس اقتباس میں قطعیت کے پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

عورت کو اللہ تعالیٰ نے لطیف جذبات سے گوندھ کر تخلیق کیا ہے۔ اس کے ایک ایک انگ سے محبت اور پیار نچھاور ہوتا ہے مرد کی نسبت عورت کے اندر خواہش کی طلب کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ رکھا ہے لیکن اپنی طبیعت میں موجود شرم و حیا کے باعث اس کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتی اور اپنے خاوند کے سامنے شرمیلے پن کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن معاشرے کی یہ بھی حقیقت ہے کہ شادی کے بعد خاص لمحات کو اپنی سہیلیوں کے گوش گزار کرتی ہے۔

سلیم اختر نے اپنے افسانے "بیویوں کی سازش" جس کی کہانی مرکزی کردار کے گرد گھومتی ہے جو اپنی سہیلیوں کی خفیہ گفتگو اپنے شوہر کے گوش گزار کرتی ہے۔ اس صورتحال کی منظر کشی اس انداز میں کی ہے:

> اصل مزا تو بیوی کی باتوں میں تھا۔ چنانچہ باتیں سن سن کر وہ ان سہیلیوں کے مزاج اور ان کے خاوندوں کی مخصوص حرکات تک کے بارے میں جان چکا تھا حتی کہ ان امور کے بارے میں بھی مثلاً اسے معلوم تھا کہ مسز توقیر کے میاں پہلے خوب سر کی مالش کراتے ہیں، ثمینہ کا خاوند بعد میں ایک سیکنڈ کے اندر سو جاتا ہے، فخر النساء نے اپنے میاں کا کتنا راتب باندھ رکھا ہے اور شمسی کی عین اس وقت بولنے کی عادت! توبہ! یہ بیویاں بھی کتنی پورنو گرافک ہوتی ہیں۔[۴۹]

سلیم اختر اس اقتباس میں میاں بیوی کی آپس کی گفتگو کے ذریعے اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ شادی کے بعد خواتین اپنی شادی شدہ زندگی کے خاص لمحات کو باریک بینی کے ساتھ اپنی دوستوں کو بتاتی ہیں اور حقیقت میں یہ بظاہر شرم وحیا کی پیکر اور شرمیلی بیویاں اصل میں شہوت کی بہترین عکس بندی کرتی ہیں۔ سلیم اختر نے اس اقتباس میں قطعیت کے پہلو کو نمایاں کیا ہے کیونکہ یہ خواتین کی فطرت کا لازمی حصہ ہے اور صداقت پر مبنی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا جوڑ بنایا تاکہ وہ نفس کی راحت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ نسل انسانی کا سلسلہ بھی جاری رکھ سکیں اور اس امر کے لیے نکاح کے رشتے کو معاشرے میں رائج کیا۔ لیکن بد قسمتی کے ساتھ ہمارے معاشرے نے اس رشتے کو آسان کے بجائے مشکل ترین بنا دیا جس کی وجہ سے نوجوان نسل بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ سلیم اختر اپنے افسانے "بچھو" میں اس صورتحال کو یوں بیان کرتے ہیں:

> تازہ جوان لڑکا اس بچھڑے کی مانند ہوتا ہے جس کا ہر وقت کلیل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ بچھڑا تو واقعی ہر وقت اور ہر جگہ کلیل کر سکتا ہے لیکن نوجوان نہیں۔ کم از کم میں تو خود کو ایسا ہی نوجوان محسوس کر رہا تھا جسے کلیل کرنے کے لیے کسی طرح کی بھی سہولت حاصل نہ تھی۔ ادھر عالم یہ تھا کہ کالج میں دو برس سیر کرنے کے باوجود میں ابھی تک فرسٹ ایئر فول ہی تھا۔ لڑکیوں سے آنکھیں چار کرنی تو کجا میں تو سینئر لڑکوں سے بھی آنکھ ملا کر بات نہ کر پاتا۔ ان حالات میں کہ کلیلوں نے معدہ میں کھلبلی مچا رکھی تھی مجھے بچھو نے مشورہ دیا کہ تم سگریٹ پیا کرو۔[۵۰]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے جانور کی جنسی زندگی اور انسان کی جنسی زندگی کا موازنہ کیا ہے کہ جانور جس وقت چاہے اپنی خواہش پوری کر سکتا ہے لیکن اس کے برعکس انسان ایسا نہیں کر سکتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

نوجوان نسل جس پر بلوغت کی وجہ سے شہوت کا غلبہ ہوتا ہے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے کیوں کہ فطری جذبہ ہر صورت میں جسم سے اخراج چاہتا ہے۔ اس کشمکش سے نجات کے لیے نوجوان نسل منشیات کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ اقتباس قطعیت کے رنگ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے کیوں کہ سلیم اختر نے واضح انداز میں نوجوان نسل کی جنسی خواہش اور ان میں حائل مسائل بیان کیے ہیں۔

اس دنیا میں ہر انسان کا آپس میں تعلق ضرورت کی وجہ سے ہے۔ اگر ضرورت نہ ہو تو انسان ایک دوسرے کے ساتھ کبھی تعلقات قائم نہ کریں ضرورت کی وجہ سے ہی انسان ایک دوسرے کے لیے خاص اور عام ہوتے ہیں۔ سلیم اختر اپنے افسانہ "بکری" میں ضرورت کی اہمیت کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> وہ تخلیق کے کرب میں مبتلا تھی اور ایک نئے وجود کی تخلیق سے اپنے وجود کا مقصد پورا کر دے گی مگر وہ۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو کچھ بھی نہ کر سکی۔ اس کی ساس اب ہر وقت بیٹے کے کان بھرتی ہے۔ وہ طلاق دلوا کر اولاد کے لیے نئی بہو لانے کی فکر میں ہے۔ کیا پتہ کل کو وہ کامیاب ہو جائے اور یوں زرینہ طلاق لے کر اپنے گھر دودھ نہ دینے والی بکری کی مانند بے مصرف اور غیر اہم زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے۔[۵]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے نظریہ ضرورت کو پیش کیا ہے کہ بکری اس لیے خاص اور اہم ہے کیوں کہ اس سے مزید بکریاں پیدا ہوتی ہیں جو مالی فائدے کا سبب بنتی ہیں۔ لیکن ایک بانجھ عورت جو اپنے شوہر کو اولاد نہ دے سکے تو طلاق کی صورت میں غیر اہم زندگی گزارنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سلیم اختر نے اس اقتباس میں تلخ حقیقت بیان کی ہے کہ ہر شے چاہے انسان ہو یا حیوان وہ صرف ضرورت کے تحت استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اگر خواہش پوری نہ ہو تو تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ یہ اقتباس قطعیت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

سلیم اختر کی افسانوی نثر میں کچھ ایسے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں جو دلچسپ تو ہیں مگر معانی کے اعتبار سے مشکل بھی ہیں۔ بات کو مختلف پہلو میں بیان کیا جاتا ہے اور قاری کو ان کے ساتھ بہت دور تک محو پرواز ہونا پڑتا ہے۔ متذکرہ اقتباسات کے ذریعے سلیم اختر کی افسانوی نثر کو قطعیت کے تناظر میں دکھایا گیا ہے۔ اب اسلوب کی صفت فکری کا اختصار کے تناظر میں جائزہ لیا جائے گا۔

۳۔ اختصار:

عابد علی عابد کے نزدیک اختصار کی عمدہ مثال یہ ہے کہ یہاں الفاظ کم سے کم استعمال ہوئے ہوں اور مدعا

مکمل طور پر بیان ہو یعنی اختصار وہ ہے جس میں اصل معنی یا مراد کم سے کم الفاظ میں بیان کیا جائے مگر کسی قسم کی تشنگی باقی نہ رہے۔

اختصار سے کلام میں جان پیدا ہوتی ہے اور یہ صفت مصنف کی خوش خلقی کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ وہ قاری کا وقت ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔ اختصار اور جامعیت سلیم اختر کے اسلوب کا خاصہ ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں روانی کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں: "سوا چھ فٹ کا تانبہ کی رنگت والا اینڈرسن جو شراب پیتا نہیں بلکہ اس میں مچھلی کی مانند تیرتا ہے۔"[۵۲]

مصنف افسانہ "دو سیارے" کے کردار اینڈرسن کا حلیہ اور کثرت شراب نوشی کو مختصر انداز میں بیان کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اپنے کلام کو خشک نہیں ہونے دیتا بلکہ تشبیہ کے ساتھ مزین کر دیتا ہے۔ چہرے کی سرخی کو تانبے اور کثرت شراب نوشی کو مچھلی کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اس طرح کہانی کا مرکزی کردار اپنی بلائنڈ ڈیٹ کا حلیہ بیان کرتا ہے: "قد میں مجھ سے تین انچ لمبی، پتلی، دبلی اور سوکھی گویا بانس نے گاگل لگا رکھی ہو۔"[۵۳]

مصنف نے بانس کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں افسانوی کردار کے دبلے پن کو بیان کیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار اپنی جذباتی کیفیت سے فرار چاہتا ہے اور کہتا ہے: "اوشا میں ڈوبتے کو شیرون تنکے کا سہارا تھی۔"[۵۴]

مصنف نے محاورے کا استعمال کرتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں اس جذباتی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ اس طرح مرکزی کردار اپنے بھائی اور دوستوں کے خون کو فراموش نہیں کر سکتا ہے اور دشمن ملک اور اس سے جڑی ہر شے سے نفرت محسوس کرتا ہے اور بھارتی خاتون اوشا سے بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "بھارتی سی آئی ڈی بڑی تیز ہے۔"[۵۵]

مصنف نے نفرت کے جذبے کو طنز کی شکل میں مختصر الفاظ کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔

افسانہ "گریز پا" کا مرکزی کردار فقیر اپنی ساتھی فقیرنی جو اسے چھوڑ کر ایک رات دوسرے فقیر کے ساتھ گزارتی ہے تو غصے میں آ کر اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ پھر احساس جرم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "پھر بھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ یہ نہ ہونا چاہیے تھا۔" وہ دوبارہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا۔"[۵۶]

افسانہ نگار نے مختصر انداز میں پچھتاوے اور احساس ندامت کو بیان کیا ہے۔ افسانہ محاذ ۱۹۷۱ء میں کہانی کا ہیرو جنگ کی وجہ سے سخت خوف میں مبتلا ہے۔ جب اس کا دوست اور بیوی راوی کے پل پر اینٹی ایئر کرافٹ گنز اور

جنگی جہاز کی آمد کا تماشہ دیکھنے کے لیے اسے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دیتے ہیں تو وہ اپنی حالت اس طرح ظاہر کرتا ہے۔ "تماشا! یہ جنگ تماشا ہے کیا؟"[۵۷]

افسانہ نگار سوالیہ لہجہ اپناتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جنگ ہمیشہ موت کا پیغام ہوتی ہے۔ اپنوں سے بچھڑنے اور تباہی کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح کہانی کا ہیرو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لوگوں کے جوش و جذبے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "ہوائی جہاز عید کے چاند کی مانند دیکھے جاتے ہیں۔"[۵۸]

افسانہ نگار نے کم سے کم الفاظ استعمال کر کے پاکستانی عوام کی دلیری کو بیان کیا ہے۔

افسانہ "جلے پاؤں کی بلی" کا موضوع صنفی تقسیم ہے۔ اہل خانہ افسانے کی مرکزی کردار نعیمہ سے امتیازی سلوک روا رکھتے ہیں جس کی وجہ سے اس میں نفسیاتی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر اوقات ماں بھی بیٹے کے بالمقابل بیٹی کی حق تلفی کر جاتی۔ اس صورتحال کو کہانی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "کلیم پالا جا رہا تھا نعیمہ پل رہی تھی۔"[۵۹]

افسانہ نگار نے مختصر انداز میں اس امتیازی سلوک کی حقیقت قاری کے سامنے کھول دی ہے۔ یعنی کلیم کو تو پورے خاندان کی توجہ حاصل تھی جبکہ نعیمہ لڑکی ہونے کی وجہ سے اس توجہ سے محروم رہی۔ اسی طرح مختلف مواقع پر کہے گئے جملے اس کو بے چین کر دیتے جیسے "منحوس تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئی۔"[۶۰]

سلیم اختر نے چھوٹے سے جملے کے ذریعے نعیمہ میں نفسیاتی الجھن کی جڑ کو بیان کیا ہے۔ انہی الفاظ کی وجہ اس کے ذہن میں یہ سوچ پختہ ہو گئی کہ معاشرے میں عزت سکون اور پہچان صرف لڑکا ہونے سے ہی مل سکتی ہے۔

افسانہ "مٹھائی کی پلیٹ اور دودھ کا گلاس" کا موضوع جنسی خواہش کی شدت ہے۔ کہانی کی مرکزی کردار زرینہ کا شوہر اس کے خیالات اور جذبات کی بالکل پرواہ نہیں کرتا، صرف جسم کا خواہش مند ہوتا جس کو زرینہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور ذہنی طور پر بے سکون ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کو کہانی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "زرینہ ہر موسم میں خشک رہنے والی ٹہنی بن چکی تھی۔"[۶۱]

افسانہ نگار نے مختصر انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ شادی جیسا حسین رشتہ زرینہ کے اندر لطیف جذبات کو نہ جگا سکا بلکہ ذہنی بوجھ کا باعث بنا ہے اور جب اس کی بیٹی شدید بیمار ہوتی ہے اور شوہر اس سے قربت کا تقاضا کرتا ہے تو وہ مختصر جواب دیتی ہے۔ "آپ کیسے ظالم ہیں۔"[۶۲]

سلیم اختر نے چھوٹے سے جملے میں زرینہ کی شادی شدہ زندگی کی ناآسودگی کو بیان کر دیا ہے۔

افسانہ "نقلی چوکیدار" کا موضوع باپ بیٹی کی محبت ہے۔ باپ نے خوشی خوشی بیٹی کا رشتہ طے کیا ہے۔ افسانے کا اختتام اس فقرے پر ہوتا ہے: "یہی! یہی کہ وہ حرام زادہ اس وقت میری پھول جیسی بیٹی کے ساتھ کیا کچھ نہ کر رہا ہو گا۔"[۶۳]

سلیم اختر نے مختصر انداز میں باپ کے افسردگی کو بیان کیا جس نے تمام عمر بیٹی کی چوکیداری کی اور اب اس چوکیداری سے دستبردار ہونا پڑا ہے اور نئے آدمی کے تصور سے افسردہ اور پریشان ہو گیا ہے۔

افسانہ "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا" میں مکالماتی انداز اختیار کیا گیا ہے:

اے خدا! پاکستان میں اسلامی نظام نافذ فرما"

عیدگاہ کے تمام نمازی "آمین!!!"

اے خدا ہمیں سچا مسلمان بنا

عیدگاہ کے کچھ نمازی "آمین"[۶۴]

چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعے افسانہ نگار نے سوچ اور عمل کے تضاد کو بیان کیا ہے کہ مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ مستجاب الدعوات بن جائیں لیکن ان میں عمل کا فقدان ہے۔ ملک میں سب اسلام کا نفاذ چاہتے لیکن عملی مسلمان کچھ افراد ہی بننا چاہتے ہیں۔

افسانہ "سفر سے واپسی" میں پرانی تہذیب کی محبت اور نئی تہذیب کی مطلب پرستی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جب فضلو نے شیخ صاحب کی موت کی خبر ان کے جاننے والے دوست احباب کو دی تو سب نے اس وقت شیخ صاحب کی کوٹھی پر آنے کے بجائے اپنی مصروفیت کا بہانہ بنا کر معذرت کر لی۔ اس صورتحال کو مصنف نے کہانی میں یوں بیان کیا ہے: " اور اب ان سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ جس ہاتھ میں ترپ کا پتہ تھا وہ اب ٹھنڈا ہو چکا ہے اور بغیر کھاد کے کھیت سونا نہیں اگلتے۔"[۶۵]

مصنف نے مختصر انداز میں اس حقیقت کو بیان کر دیا ہے کہ نئی تہذیب میں دوستی صرف دولت کی وجہ سے ہوتی ہے۔

افسانہ "رزق حلال" ایک اسکول ماسٹر کی کہانی ہے جو دینیات کے مضمون میں اپنی سخت گیری کی خاصی شہرت رکھتا ہے۔ مصنف سکول میں اپنے پہلے دن کا احوال کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:

"تم!

جی ماسٹر جی" میں ہڑ بڑا کر کھڑا ہو گیا

کیا تم کرسٹان ہو؟

"جی نہیں"

ہندو ہو؟

"جی نہیں"

سکھ ہو؟

"جی نہیں"

تو پھر یہ نیکر کیوں پہن رکھی؟"[۶۶]

مصنف نے چھوٹے چھوٹے فقروں کی مدد سے لباس کے حوالے سے ماسٹر صاحب کا معتصبانہ رویہ ظاہر کیا۔ان کے خیال میں نیکر صرف غیر مذہب لوگوں کا لباس ہے۔ مسلمانوں کا یہ لباس نہیں ہے۔

افسانہ "درد کا بندھن" کا موضوع ساس بہو کی رقابت ہے۔ کہانی کا ہیرو اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے اسے کہتا ہے کہ :

'ہر بیوی یہی چاہتی ہے کہ وہ گھر میں اکیلی ہو اس کا گھر پر راج ہو اور خاوند کے اگلوں پچھلوں میں سے کوئی نہ ہو۔

سسکیاں! سسکیاں" [۶۷]

سلیم اختر نے مختصر انداز میں بیوی کی ملکیت والی سوچ کو ظاہر کیا جو گھروں میں اصل فساد کی جڑ بنتا ہے۔

افسانہ "دھرتی کی زنجیر" کا موضوع قحط سالی اور کسان کا اپنی زمین سے محبت ہے۔ جب کسان اپنی ماں سے شہر جانے کی اجازت طلب کرتا ہے کہ اب حالات کا تقاضہ یہی ہے تو اس کی ماں جواب دیتی ہے کہ "حالات" وہ نفرت سے بولی حالات مردوں کے سامنے کیا حیثیت رکھتے ہیں مرد تو خود حالات ہوتے ہیں۔"[۶۸]

مصنف نے مختصر انداز میں مرد کی قوت کو بیان کیا ہے۔

افسانہ "بچہ جمورا" میں بچہ جمورا اپنے عامل کے سوالات کے جوابات دے رہا ہے جو ملکی حالات سے متعلق ہیں۔افسانے کے آخری سوالات نگران اور حاکم کے بارے میں ہیں:

"نگران "

کیا کرتا ہے۔

"ذمہ داری سے نگرانی کرتا ہے۔"

"اور کیا دیکھا؟"

حاکم

کیا کرتا ہے؟

رعایا سے محبت

تم کون؟

میں کون؟

خاموشی" [۴۹]

حاکم وقت عامل ہے اور رعایا بچہ جمورا۔ مصنف اس مکالماتی انداز کو اس طرح واضح کرتے ہیں۔ جبر اور اختیار کے وقت عوام کی عافیت خاموشی میں ہے۔

افسانہ "بیویوں کی سازش " میں مصنف شادی شدہ خواتین کی فطرت کو بیان کرتے ہیں: "توبہ ! یہ بیویاں بھی کتنی پورنو گرافک ہوتی ہیں۔" [۵۰]

مصنف نے مختصر انداز اپناتے ہوئے خواتین کی اس فطرت کی عکاسی کی ہے کہ مخصوص لمحات کو اپنی دوستوں کے درمیان کھلم کھلا بیان کرتی ہیں۔ افسانہ مس احمد بی۔اے بی ٹی میں شادی شدہ زندگی کی صورت حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "میں نے شادی کے نام پر اپنی ماں کو جوتے کھاتے دیکھا ہے۔" [۵۱]

مصنف نے مختصر انداز میں شادی شدہ زندگی میں عورت پر ہونے والے تشدد کو بیان کیا ہے کی شادی وہ عہد ہے جس میں دو فریق ایک دوسرے کے حقوق اور ادب واحترام کا خیال رکھنے کا اقرار کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس عورت اس رشتے میں بندھ کر اپنے شوہر کے ہاتھوں تذلیل کا شکار ہوتی ہے۔

افسانہ "آگ تاپنے کے فوائد" میں پیسے کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "پیسہ ہو تو لڑکیاں خود پیسے والے مرد کو سونگھ لیتی ہیں۔" [۵۲]

مصنف نے مختصر انداز میں زمانے کی حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اس معاشرے میں پیسے والا مرد ہی قابل عزت ہے اور اگر مرد مالدار ہے تو عورتیں خود بخود اس کے ارد گرد اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اسے لڑکیوں کو پھانسنے کے لیے کوئی محنت اور تگ و دو نہیں کرنی پڑتی۔

افسانہ "عذاب میں گرفتار بستی" میں سلیم اختر پانی کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں: "پانی تو زندگی ہے۔"[۳۳]

مصنف نے مختصر انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ زمین پر زندہ رہنے کے لیے پانی بہت ضروری ہے۔ اسی طرح افسانے میں پانی کی قلت کے باعث پانی کی شدید خواہش کو اس طرح بیان کیا ہے: "مجرم کو بھی پانی پلا کر ہلاک کرتے ہیں۔"[۴۴]

سلیم اختر نے مختصر انداز میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جب سزا یافتہ انسان کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو اس وقت بھی پانی پلا کر اسے مارا جاتا ہے۔ اسی طرح مصنف نے اس افسانے میں پانی کی قلت کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورتحال کو بیان کیا ہے: "گائے نے مر کر یہ احساس کرا دیا تھا کہ وہ کتنا عرصہ نکال گئی تھی اور باقی کتنا عرصہ لگاتے ہیں۔"[۴۵]

مصنف نے مختصر انداز میں پانی کی قلت سے پیدا ہونے والی خوفناکی اور موت کی نزدیکی کو بیان کیا ہے کہ گائے کا مرنا سب کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے کیوں کہ باقی سب کے لیے بھی وقت کم ہی رہ گیا ہے۔

افسانہ "زنجیر" میں سلیم اختر ریل گاڑی میں ہلتی زنجیر کے بارے میں کہتے ہیں: "زنجیر اب عافیت کا کنارہ تھی۔"[۴۶] سلیم اختر مختصر انداز میں قاری کو اس سچائی کے متعلق بتاتے ہیں کہ مزاحمت ہی میں انسان کی سلامتی پوشیدہ ہے۔

افسانہ "سائے کی طرح ساتھ پھریں" میں سلیم اختر موت کے حوالے سے بیان کرتے ہیں: "حرام موت کے بعد روح بھٹکتی رہتی ہے۔"[۴۷]

مصنف نے مختصر انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ زندگی اللہ کی امانت ہے اور اللہ ہی زندگی اور موت کا مالک ہے۔ اور جو لوگ اپنی زندگی کا خاتمہ خود کرتے ہیں ان کی روح ہمیشہ بے سکون اور تکلیف میں مبتلا رہتی ہے۔

سلیم اختر کو مختصر جملوں میں اپنا مدعا بیان کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ درج بالا اقتباسات کے ذریعے سلیم اختر کے افسانوی نثری اسلوب کی فکری صفت کا جائزہ اختصار کے تناظر میں لیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاہین مفتی،سلیم اختر: شخصیت اور فن(اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۱۵ء)، ص ۳۷۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔

۳۔ سید عابد علی عابد، اسلوب(لاہور: مجلسِ ترقی ادب،۱۹۹۶ء)، ص ۱۰۳۔

۴۔ سلیم اختر،کڑوے بادام(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۰۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۷۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۹۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۹۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۰۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۳۔

۱۳۔ سلیم اختر،کاٹھ کی عورتیں(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۱۰۔

۱۴۔ سید عابد علی عابد، اسلوب ،ص ۱۰۹۔

۱۵۔ شاہین مفتی،سلیم اختر : شخصیت اور فن ،ص ۲۳۹۔

۱۶۔ سلیم اختر،مٹھی بھر سانپ(کتاب پوئٹ، بلاگ پوسٹ)، ص ۲۸۔

۱۷۔ سلیم اختر، کاٹھ کی عورتیں، ص ۱۴۔

۱۸۔ طاہر تونسوی،ہمسفر بگولوں کا(لاہور: الفیصل بار دوم، ۲۰۱۳ء) ص ۱۸۴۔

۱۹۔ سلیم اختر، مٹھی بھر سانپ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۴۔

۲۰۔ عصمت جمیل، نسائی شعور کی تاریخ: اُردو افسانہ اور عورت (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۵۵۔۱۵۶۔

۲۱۔ سلیم اختر، کاٹھ کی عورتیں، ص ۱۵۹۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۹۸۔

۲۴۔ سلیم اختر، عورت جنس جذبات (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء)، ص ۲۵۰۔

۲۵۔ سلیم اختر، کاٹھ کی عورتیں، ص ۱۲۶۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔

۲۷۔ سلیم اختر، چالیس منٹ کی عورت (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۰۲۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔

۳۰۔ سلیم، کڑوے بادام، ص ۱۶۰۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۵۹۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۲۹۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۱۶۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۲۰۔

۳۹۔ ایضاً، ص۱۲۱۔

۴۰۔ ایضاً، ص۱۲۱۔

۴۱۔ ایضاً، ص۱۵۰۔

۴۲۔ ایضاً، ص۱۵۳۔

۴۳۔ ایضاً، ص۱۵۴۔

۴۴۔ ایضاً، ص۱۸۳۔

۴۵۔ ایضاً، ص۲۰۶۔

۴۶۔ ایضاً، ص۲۱۰۔

۴۷۔ ایضاً، ص۲۲۰۔

۴۸۔ ایضاً، ص۱۵۱۔

۴۹۔ ایضاً، ص۱۹۴۔

۵۰۔ ایضاً، ص۲۰۲۔

۵۱۔ ایضاً، ص۱۵۱۔

۵۲۔ سلیم اختر، مٹھی بھر سانپ، ص۲۲۔

۵۳۔ ایضاً، ص۱۰۷۔

۵۴۔ سلیم اختر، کڑوے بادام، ص۱۲۱۔

۵۵۔ ایضاً، ص۱۲۲۔

۵۶۔ ایضاً، ص۱۲۲۔

۵۷۔ ایضاً، ص۱۴۷۔

۵۸۔ ایضاً، ص۱۰۷۔

۵۹۔ سلیم اختر، آدھی رات کی مخلوق (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص۱۸۱۔

۶۰۔ سلیم اختر، کڑوے بادام، ص۱۷۔

۶۱۔ ایضاً، ص۱۹۔

۶۲۔ ایضاً، ص۳۲۔

۶۳۔ ایضاً، ص۳۳۔

۶۴۔ ایضاً، ص۵۰۔

۶۵۔ ایضاً، ص۱۴۔

۶۶۔ سلیم اختر، کاٹھ کی عورتیں، ص۱۱۸۔

۶۷۔ ایضاً، ص۱۱۸۔

۶۸۔ ایضاً، ص۱۶۶۔

۶۹۔ ایضاً، ص۱۶۸۔

۷۰۔ ایضاً، ص۲۱۱۔

۷۱۔ سلیم اختر، آدھی رات کی مخلوق، ص۱۶۹۔

۷۲۔ سلیم اختر، کڑوے بادام، ص۵۴۔

۷۳۔ ایضاً، ص۶۴۔

۷۴۔ ایضاً، ص۹۱۔

۷۵۔ ایضاً، ص۱۰۳۔

۷۶۔ ایضاً، ص۱۰۷۔

۷۷۔ ایضاً، ص۲۲۹۔

باب سوم

سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کی جذباتی صفات کے تحت سلیم اختر کی افسانوی نثر کا جائزہ

باب سوم:

سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کی جذباتی صفات کے تحت سلیم اختر کی افسانوی نثر کا جائزہ

اس میں کوئی شک نہیں کے نثر نے بڑی جلدی ترقی اور ارتقاء کے مراحل طے کیے ہیں۔ علم و فنون فکر و فلسفہ اور قانون کے کوائف نثر کے ذریعے سے ظاہر کیے گئے لیکن تخلیقی نثر بہت دیر کے بعد وجود میں آئی۔ پس رفتہ رفتہ نثر بتدریج اپنی ممکنات سے آگاہ ہو کر تخلیقی بنتی چلی گئی اور اس کا جمالیاتی عنصر کھل کر سامنے آنے لگا۔

نثر جذبات کو اکساتی ہے اور یہی اس کے تخلیقی ہونے کی نشاندہی ہے۔ تخلیقی نثر میں ادیب کو اپنے متنوع اور بعض اوقات غیر شخصی جذبات کو زبان عطا کرنا ہوتی ہے تو پھر وہاں نثر کا دامن تھامتا ہے۔ بعض جذباتی صفات خاص طور سے شعر سے منسوب ہیں لیکن نثر میں بھی انہیں اب بہت حد تک اہمیت ملنے لگی ہے۔ عابد علی عابد انداز بیاں کو موضوع بحث بناتے ہوئے اسلوب کی تین جذباتی صفات زورِ بیاں، گداز اور مزاح بیان کرتے ہیں۔ لہذا اب سلیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب جذباتی صفات کے ذیل میں دیکھا جائے گا۔ ذیل میں زورِ بیان کی صفات کو بیان کیا جاتا ہے۔

زورِ بیان:

عابد علی عابد کہتے ہیں کہ "زور "اشتداد جذبات کا حامل ہے یعنی کہ یہ جذبات کی شدت کو نثر یا شعر میں ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عابد علی عابد نے زورِ بیان کے حوالے سے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ شعر ادب کی ہیں کیونکہ ان کے خیال میں زور بیان یعنی کہ جذبات کی شدت کا اظہار زیادہ بہتر طور پر اشعار کے ذریعے سے ہی ہو سکتا ہے لیکن اس حوالے سے وہ غالب کی نثر کو بھی اہمیت دیتے ہیں جنہوں نے اپنے اسلوب میں زور و بیان جیسی جذباتی صفت کو بہت خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ پس عابد علی عابد زورِ بیان سے مراد جذبات کی شدت لیتے ہیں یہاں جذبے کی کیفیت بے حد قوی ہوتی ہے۔ اس جذباتی صفت میں مصنف یا ادیب جذبے کی شدت کو بیان کرتے ہیں اور اسے مکمل طور پر احساسات و جذبات کے روپ میں ڈھال کر قلم پر اتارتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک

نثر میں زورِ بیان تبھی ہو گا جب واردات قلب کو بیان کرنے کے لیے ادیب کے پاس زور کلام اور جوش بیان کی خوبی موجود ہو گی۔

سلیم اختر کی یہ خاصیت ہے کہ آپ مختلف قسم کے اسلوب کو تحریر کرتے تھے اور خاص طور پر آپ کی تحریر میں تین موضوعات نفسیات، جنس اور تنقید کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہیں۔ سلیم اختر کی افسانوی نثر اس خصوصیت کی حامل ہے جس میں آپ نے بعض اوقات جذبے کو مکمل شدت کے ساتھ الفاظ میں ڈھالا ہے۔ عابد علی عابد کے مطابق نثر میں "زور بیان" کو اس طرح استعمال نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ اس کا استعمال شاعری میں ہوتا ہے۔

سلیم اختر کے افسانوں پر نظر دوڑانے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عابد علی عابد کی بات شاید مکمل درست نہیں کیوں کہ انہوں نے اپنے اسلوب میں بہت سی جگہوں پر بہترین انداز اپناتے ہوئے جذبات و احساسات کی شدت کو اس عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کی شدت قاری خود محسوس کرتا ہے۔ آپ کے افسانے بہترین انداز میں کسی بھی جذبے کی شدت کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جیسے افسانہ "محاذ ۱۹۷۱ء" جس کا موضوع مشرقی پاکستان کا المیہ ہے۔ اس میں مرکزی کردار کے جذبات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں:

ایک رات!

> وہ رات دیگر راتوں سے کچھ زیادہ ہی دہشت ناک ثابت ہوئی۔ بلیک آؤٹ میں ڈوبا گھر اور گھر کو گھیرے ہوئے لاہور شہر مجھے ہراساں کر رہا تھا۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ چاندنی بری لگی اس کی دودھیا روشنی میں اب رومانس نہ تھا یہ تو دشمن کو میرا گھر دکھانے والی دشمن چاندنی تھی۔ بھلا یہ مجھے کیسے بھاتی! اندھیرے کمرے میں لحاف میں منہ لپیٹے، آنکھیں کھولے، گٹھڑی بنا ہوا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے نیند نہ آئے گی۔[۱]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے زورِ بیان کی صفت کا استعمال کیا ہے۔ مرکزی کردار کی بے چینی اور بے قراری کو بیان کیا ہے۔ جنگ کی وجہ سے پیدا ہونے والے جذبات کی شدت بیان کی ہے۔ چاندنی جو خوبصورتی اور سکون کا باعث ہے لیکن اس وقت سب سے بڑا خطرہ ہے۔

اسی طرح افسانہ "دو سیارے" جس کا موضوع بھی مشرقی پاکستان کا المیہ ہے میں مرکزی کردار کی نفسیاتی کشمکش کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کیا ہم تم دوست بن سکتے ہیں مگر میں اب بے بس ہوں۔ اکٹوپس کا گھیرا مکمل ہو چکا ہے۔ اس

کے بازو میرے جسم کو جکڑے جیسے خون چوس رہے ہیں۔ میرا دل کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ ذہن کے دریچے بند ہیں اور آنکھوں کی کھڑکیاں بند ہیں۔ میرا دوسرا وجود باہر پہرہ پر ہے اور اندر میں محبوس۔[۲]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے جنگ کے دوران اپنوں کی جدائی اور ان کے قتل کی وجہ سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش اور دکھ کی شدت کو بیان کیا ہے۔ اس بے قراری اور بے چینی کو پیش کیا ہے جس کی وجہ سے مرکزی کردار دشمن ملک سے تعلق رکھنے والے کسی بھی فرد سے دوستی کا رشتہ نہیں قائم کر سکتا۔

اکٹوپس کی تشبیہ دکھ اور دوسرا وجود کا استعارہ نفرت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح افسانہ "گریز پا" جس کی کہانی خاندانی فقیر کے گرد گھومتی ہے جس میں مرکزی کردار اپنی محبوبہ کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ

لڑکی بڑی چلبلی ثابت ہوئی۔ آنکھوں کی مانند جسم کی بوٹی بوٹی مٹکتی رہتی وہ چلتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کرچیوں پر چل رہی ہو۔ یہ چال کا وہ انداز تھا جو بڑے پیسے والی بیگمات کو چھ انچ لمبی ہیل کی جوتی پہن کر بھی نصیب نہ ہو سکتا تھا اگر۔۔ اس کے جسم میں سے پسینہ اور گلیوں کی گرد کی بو نہ چھٹی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اب اس کی آسودہ جوانی مہک بھی شامل ہو گئی تھی اور ان سب کے امتزاج نے اسے نشیلی بنا دیا تھا۔ اس کی نصیب میں بھیک مانگنا دربدر کی خاک چھاننا نہ رہا تھا چنانچہ دونوں یوں چلتے گویا ٹورسٹ ہوں۔[۳]

درج بالا اقتباس میں دل کی کیفیت اور لطیف جذبات کی شدت کو بیان کرنے کے لیے محبوبہ کے لچکیلے پن کو آنکھوں سے تشبیہ دی اور جوانی کا جوبن اور اس کی قربت و ہمراہی جگہ جگہ کی خاک چھاننے کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔ محبوب دل کو بھا جائے تو اس کا وصل ہر شے کو حسین بنا دیتا ہے۔ اس دنیا کا دوسرا نام ہوس و لالچ ہے۔ اس صورت حال کی عکس بندی افسانہ "سفر سے واپسی" میں کی گئی ہے جس کا موضوع پرانی تہذیب کی محبت اور نئی تہذیب کی مطلب پرستی ہے۔ ہر کوئی دولت کا پجاری ہے جیسے:

فضلو! آخر تمہیں میرے دوست اچھے کیوں نہیں لگتے؟ شیخ صاحب یہ سب مطلبی سے لگتے ہیں" وہ ہنس دیے۔ "مطلبی سے نہیں بلکہ مطلبی ہیں۔ پھر بھی آپ۔

"میں ایک ٹھیکیدار ہوں۔ کاروباری انسان ہوں چیزوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بھی خریدنا اور بیچنا پڑتا ہے۔ یہ سب بڑے بڑے افسر ہیں۔ اونچے گھرانوں کے ہیں۔ ڈگریوں والے ہیں۔ میں ان کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ کیوں پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ اس لیے کہ ترپ کا پتہ میرے ہاتھ میں ہے۔ کیا مطلب؟ دولت پیسہ اور کیا"

میں ان پر خرچ کرتا ہوں انہیں رشوت دیتا ہوں۔ یہ میرے بگڑے کام بناتے ہیں یوں سمجھ لو
یہ کھیت ہیں جن میں پیسے کی فصل بوتا ہوں اور پھر پیسے کی فصل کاٹتا ہوں۔ دوستی تو نہ ہوئی۔
گدھے ہو تم۔ دوستی کاہے کی۔ پیسہ ہم دونوں کا مشترک دوست ہے۔[۴]

پس اقتباس میں سلیم اختر نے مادیت پرستی، ہوس، لالچ، خود غرضی زیادہ کی چاہت اور دولت کی طلب جیسے غاصبانہ رویے کی شدت کو مکالماتی انداز میں الفاظ کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ اور لالچ کے جذبے کی شدت کو بھی واضح کر دیا ہے مطلب پرست کی دوستی صرف پیسہ ہے۔ انسان دنیاوی نمود و نمائش کے حلال و حرام کا فرق کیے بغیر دولت جمع تو کر لیتا ہے لیکن سفر آخرت اس نے تنہا ہی طے کرنا ہوتا ہے جیسے:

شیخ صاحب کی موت اچانک بھی تھی اور بے موقع بھی۔ رات گیارہ کے قریب بیڈ روم سے
لڑکی کے چیخنے کی آواز سن کر فضلو آنکھیں ملتا ہوا بھاگا تو کمرے کی سبز روشنی میں صرف شمیض
پہنے لڑکی نظر آئی۔ اس کے بال بکھرے تھے اور خوف سے آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی
تھیں۔ شیخ صاحب مردہ تھے فضلو نے جھک کر دل دیکھا نبض دیکھی اور پھر چادر سے انہیں
ڈھک دیا۔ لڑکی کس وقت بھاگی فضلو کو علم نہ ہو سکا۔ بیٹے، بیٹی، بیوی، داشتہ، نوکر فضلو سبھی
کے بغیر شیخ نے نیند میں دم دے دیا۔[۵]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے موت کو دیکھ کر پیدا ہو جانے والی ہیجانی کیفیت اور موت کی سفاکیت کی شدت کو الفاظ کے روپ میں پیش کیا ہے کہ انسان اس قدر کمزور ہے کہ مردہ انسان کو دیکھ خوف زدہ ہو جاتا ہے اور موت ایک لمحے کے لیے بھی کسی کو مہلت نہیں دیتی ہے۔

ملک خداداد پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور یہ طے شدہ تھا کہ اس میں نظام حیات بھی اسلام کے اصولوں کے مطابق ہو گا لیکن صورتحال اس کے برعکس پیش آئی۔ افسانہ "رزق حلال" جس کی کہانی سکول ماسٹر کے گرد گھومتی ہے جو دینیات کے مضمون میں اپنی سخت گیری کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے اس ساری صورتحال پر سخت نالاں ہیں جیسے:

ہمارے ملک کا تو ستیہ ناس ہو گیا ہے اس قدر بے حیائی ہو گئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ لڑکیاں
دوپٹوں کے بغیر چھاتیاں مٹکاتی چلتی ہیں۔ لباس ہیں تو ان میں بھی بے حیائی آ گئی۔ پردہ رہا نہیں
نہ آنکھ کا اور نہ جسم کا۔ ہر طرف سینما ہے جن میں گندی گندی انگریزی فلمیں چلتی ہیں اور کوئی
روکنے والا نہیں۔ ظلم خدا کا منہ چومتے مرد عورت کے اشتہار کھلے بندوں لگتے ہیں اور کوئی
روکنے والا نہیں۔ گند ادب گھر گھر غلاظت بکھیر رہا ہے جسے دیکھو گندی خواہشات کے پیچھے

دیوانہ وار پھر رہا ہے۔ کیا پاکستان اس ناپاکی کے لیے بنا تھا کہ عورتیں بے حیا ہوں اور مرد بے غیرت۔ ارے! ان سب کو تو سر عام گولی سے اڑا دینا چاہیے۔ ان کی سزا تو رجم ہے۔ سب کو سنگسار کر دو یہ سب ہماری گندی فلموں کا قصور ہے اور اس سے بھی بڑھ کر مغرب سے آنے والی گندی گندی کتابوں کا ہے۔ حد ہو گئی! شرافت اور اخلاق ہی ختم ہو گیا نہ چھوٹے کا لحاظ نہ بڑے کا ادب، نہ بزرگوں کا احترام۔ نماز، روزہ، قرآن سب کو بھلا بیٹھے سب شیطان کے چیلے ہیں۔ سب خبیث ہیں۔ سب مردود ہیں۔ اور اب گالیوں کی گردان شروع ہو چکی تھی۔[۱]

درج بالا اقتباس میں فیشن کے نام پر بے حیائی اور مغربی تقلید سے نفرت و حقارت کے جذبے کی شدت کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسے اظہار کو معاشرہ مذہبی انتہا پسندی اور تعصب کا نام تو دے دیتا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ یہ طرز حیات عورت سے شرم و حیا کا زیور ختم کرنے کا باعث بن رہا ہے تو دوسری طرف معاشرتی بے راہ روی اور مذہب سے دوری کا سبب بھی ہے۔

خوبصورتی اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے اور خوبصورت شے کو ہر انسان پسند کرتا ہے لیکن اس دنیا میں اگر کوئی انسان پیدائشی طور پر یا حادثاتی طور پر اس نعمت سے محروم ہو تو دنیا اس کو مذاق کا نشانہ بناتی ہے۔

افسانہ "آئینہ" ایک خوبصورت لڑکی کی کہانی ہے جو محبت اور راحت سے بھرپور زندگی بسر کر رہی تھی لیکن ایک حادثے کی وجہ سے چہرے کی خوبصورتی کھو بیٹھتی ہے جیسے:

وہ کب تک آئینے توڑ سکے گی اس کے ذہن نے اسے سمجھایا۔ آئینے توڑے جا سکتے ہیں لیکن تمسخر اڑانے والی آنکھوں کو اندھا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے حسن کے مرقد پر ویرانے میں جلتے چراغوں ایسی آنکھوں سے اشک کب تک بہائے گی؟ کب تک؟؟ آخر کب تک؟؟[۲]

درج بالا اقتباس میں لوگوں کے ناروا سلوک سے پیدا ہونے والی جذبات کی شدت کو بیان کیا ہے کہ انسان آئینہ توڑ سکتا ہے لیکن لوگوں کی فطرت نہیں بدل سکتا۔ اس لیے اپنی بے بسی پر آنسو بہانے کی بجائے خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مرد اور عورت کے وجود کو ایک دوسرے کے سکون کے لیے تخلیق کیا گیا لیکن پدرسری نظام میں عورت پر عائد حد سے زیادہ ذمہ داریوں نے اس کو دباؤ کا شکار کر دیا ہے۔ اس صورتحال کو افسانہ "احمق کٹھ پتلی" میں پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کا موضوع عورت کی مظلومیت اور مردانہ جارحیت ہے۔ کہانی کٹھ پتلیاں بنانے والے کے گرد

گھومتی ہے اور جب وہ اپنی من پسند کٹھ پتلی بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو افسانے میں ان کے ذریعے مرد اور عورت کے جذبات کو بیان کیا جاتا ہے جیسے :

> کچھ نہیں بس کھانا پکا کر گرم رکھنا تاکہ جب میں تھکا ہارا گھر آؤں تو مجھے گرم گرم کھانا ملے۔ وہ کیوں؟ بھئی تم بیوی جو ٹھہری، اچھا! اور کیا کیا کرنا ہوگا؟ کچھ نہیں بس کبھی کبھی۔۔ میرا مطلب ہے کہ بعض راتوں کو۔۔ وہ کیوں؟ بھئی تم بیوی جو ٹھہری، اچھا! اور کیا کرنا ہوگا؟ کچھ نہیں بس جب بچے پیدا ہوں گے تو ان کی دیکھ بھال اور پرورش۔۔ اور؟ پھر اور بچہ۔۔ اور؟ اور شاید پھر اور بچہ۔۔ کب تک؟ عمر بھر! وہ ایک دم چیخ کر بولی میں بیوی نہیں بنتی۔ میں بیوی نہیں بنتی۔ مگر۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اب وہ بھی غصہ میں بولا۔ احمق کٹھ پتلی۔ تو شاید جانتی نہیں کہ اپنی بیوی بنا کر میں تمہیں کتنی بڑی عزت دے رہا ہوں۔ نہیں! مجھے اپنی زندگی اور آزادی کی قیمت دے کر عزت کا یہ سودا منظور نہیں ہے۔ وہ اب غصہ کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ تمہیں پتہ نہیں تم کس سے بات کر رہی ہو؟ مت بھولو کہ میں نے تمہیں بنایا ہے۔ کٹھ پتلی نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر کاٹھ کا منہ نہ کھل سکا۔ اس نے پلکیں جھپکا کر آنکھوں میں آئے آنسو بہانا چاہے مگر کاٹھ کی آنکھوں میں آنسو کہاں۔[۵]

سلیم اختر اپنے افسانوں میں جذبات کو افسانوی کرداروں کے مکالمے کی صورت میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے مرد اور عورت کے جذبات و احساسات کی شدت کو بیان کرتے ہوئے معاشرے کے تلخ حقائق کو بیان کیا ہے۔ بیوی اور شوہر کا احساسات کو زبان دی ہے کہ کس طرح عورت شادی شدہ زندگی میں عائلی استحصال کا شکار ہوتی ہے اور مرد طاقتور ہونے کی وجہ سے اس کی مزاحمت میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ دراصل مصنف عورت کی بیوی کے روپ میں بے بسی پر نالاں ہے۔ یہ اقتباس زورِ بیان کی بہترین مثال ہے۔

عورت کا تعلق کسی بھی معاشرے سے ہو جنسی استحصال کے بعد اس کا معاشرہ میں رہنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ سلیم اختر افسانہ "سانتا کلاز کا زوال" میں معاشرتی ناہمواریوں اور ذاتی کرب کو بیان کرتے ہیں جیسے :

> بات یہ ہے۔ عورت نے اٹک اٹک کر بولنا شروع کیا۔ بچی کا کوئی باپ نہیں۔ کیوں؟ کہ میرا خاوند کوئی نہیں۔ کیوں؟ وہ چڑ کر بولی۔ سانتا کلاز ہوتے ہوئے تم اتنے احمق کیوں ہو؟ اور تو یہ بات ہے۔ نہیں۔ وہ زور سے بولی۔ وہ بات نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ تو پھر؟ مجھے کئی مردوں نے مل کر خراب کیا اور وہ بھی کرسمس والے دن! یہ بدقسمت کرسمس کے اس حادثہ کا تحفہ

ہے۔ کسی نے میری باتوں پر یقین نہ کیا میں شریفوں کی بستی سے نکلنے پر مجبور ہو گئی تنہا! اوہ۔ اب میں اکیلی رہتی ہوں اور اسی طرح روزی کماتی ہوں جس طرح روزی کمانے کا ایک دروازہ میرے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ سانتا کلاز کا دل درد سے بھر گیا۔ وہ بولے جا رہی تھی۔ اب سمجھے! کہ تم اس احمق بچی کو کرسمس کے تحفے میں باپ نہیں دے سکتے۔ وہ تلخی سے ہنسی۔ خود میں بھی نہیں جانتی کہ یہ کس مرد سے ہے وہ کئی تھے شکار کتوں کی مانند کرسمس کی شراب کے نشہ میں اندھے اپنی ہوس کی بھوک کے اسیر، میں روئی، چلائی، دہائی دی مگر نہ کوئی مدد کو آیا نہ شنوائی ہوئی۔ وہ خاموش ہو گئی پھر آنسو بھری آنکھوں کو مسل کر بولی۔ اور یہ احمق لڑکی باپ مانگتی ہے اور وہ بھی کرسمس پر۔

سرد خانہ کی تاریک سیڑھیوں پر سر جھکائے وہ تینوں خاموش بیٹھے تھے اپنی اپنی اداسی کے اسیر! سانتا کلاز مسلسل سوچ رہا تھا انہیں تحفہ میں کیا دے؟ وہ اچانک بولا۔ کیا تم اس کرسمس کے مبارک دن مجھے لٹی ہوئی عزت تحفے میں دے سکتے ہو؟ [۹]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے دکھ، تکلیف، درد، محرومی کے احساس کی شدت کو مکالمے کے روپ میں اس طرح قاری کے سامنے پیش کیا ہے کہ قاری یہ درد خود پر طاری ہوتا محسوس کرتا ہے۔ یہ اس معاشرے کی تلخ حقیقت ہے کہ عورت چاہے بے گناہ ہو جنسی استحصال کے بعد کوئی انسان اس کی مرہم نہیں بنتا بلکہ اس کو مزید برائی کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔

سلیم اختر کو یہ قدرت حاصل تھی کہ وہ اپنے افسانوی کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھر کر اس کے جذبات بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جیسا کہ افسانہ "پھن پھول" میں انہوں نے گدھ کی خوشی کی شدت کو بیان کیا ہے جب اسے بغیر کسی مشکل اور محنت کے بہت سارا کھانا میسر آ جاتا ہے جیسے:

گدھ کو اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کھابے کا بلا شرکت مخبرے مالک ہے۔ اس نے خوشی خوشی گائے کے ارد گرد اُچھلتے ہوئے دو تین چکر لگائے پھر آسمان کی جانب دیکھا جہاں اور کوئی گدھ نہ تھا۔ پھر گردن ٹیڑھی کر کے بستی کو دیکھا کوئی کوا اور کتا بھی حصہ بٹانے کو نہ تھا۔ یقیناً وہ اس دعوت کا مالک تھا۔ اس کی آنکھیں لذت کے احساس سے چمک رہی تھیں۔ [۱۰]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے زیادہ کی طلب اور ملکیت کے جذبے کی شدت کو گدھ کے ذریعے بیان کیا ہے۔ گدھ کے ذریعے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان بھی اس فطرت کا مالک ہے وہ بھی ہر شے کا تنہا مالک بننا چاہتا ہے اور ہمارا معاشرہ بھی مجموعی طور پر یہی رنگ پیش کرتا ہے کہ دوسرے کی شرکت کے بغیر ہی مال و

دولت میں لطف اور مزہ ہے۔

افسانہ "پھن پھول" کا موضوع محبت کی کاملیت ہے جو لذت مرگ پر ختم ہوتا ہے جیسے:

> سانپ ندی میں سانپ جل تھا۔ سانپ جل میں سانپ امرت تھا سانپ بیل میں سانپ پتے تھے۔ سانپ کلی میں سانپ پھول تھا، سانپ پنکھڑ میں سانپ رس تھا۔ سانپ پھل میں سانپ من تھا۔ وہ ناگ شجر کے سایہ میں تھے۔ ناگ شاخوں پر پھن پھول کھلے تھے اور وہ دونوں پھن پھولوں کی بارش میں تھے۔[11]

اقتباس میں سلیم اختر نے محبت کے جذبے کی شدت کو بیان کیا ہے کہ اصل محبت کی منزل یہی ہے کہ عاشق کو اپنے محبوب کا وصل حاصل ہو جائے اور وہ ایک دوسرے کی محبت میں فنا ہو کر ہمیشہ کے لیے امر ہو جائیں۔ کسی عورت کے احساسات و جذبات ہوں یا کسی مرد کے خیالات، بچوں کے قہقہہ ہوں یا رونا، جانوروں اور کٹھ پتلیوں کے خیالات کو کاغذ پر اتارنا ہو یا کوئی پرانی کتھا پر مبنی حقیقت بیان کرنی ہو سلیم اختر نہایت عمدگی کے ساتھ افسانوی نثر میں جذباتی صفات کو پیش کرتے ہیں۔ پس ان تمام اقتباسات سے واضح ہے کہ سلیم اختر کی افسانوی نثر میں زور بیان کی صفت استعمال کی گئی ہے۔

گداز:

عابد علی عابد کے مطابق جذباتی صفات میں گداز دوسری صفت ہے اور اس کے معنی دکھ، درد، غم، اندوہ، مصیبت، تجربہ وغیرہ کے جذبوں کے طور پر بیان کیے ہیں۔ مغربی مفکرین کی رائے کے مطابق انسانی زندگی یا تجربات کی وہ صفت جو رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرے یا خارجی حالات میں کوئی ایسا تغیر جس سے یہی ذہنی کیفیت پیدا ہو یعنی کہ گداز ایسی صفت ہے جو کہ رحم کے جذبات کو انسان کے اندر اکساتی ہے یعنی جذبات و احساسات کے متعلق وہ انداز تحریر جو رحم کے جذبات اکسائے۔ اس کے علاوہ غم، دکھ، درد، اندوناک تجربات سے بھی روشناس کرواتی ہے۔ مختصر یہ کہ روح انسانی کی لطیف ترین کیفیت کو کہتے ہیں اور دکھ یا درد جذبات و تاثرات لطیف میں شامل نہیں اس لیے غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا کہ جب دکھ کا بیان نہ کیا جائے تو گداز کی صفت پیدا نہ ہو گی۔ درحقیقت روح انسانی کی دھوپ چھاؤں میں ایسے مقام بھی آتے ہیں کہ دکھ سے بھی اپنا رشتہ جوڑتے ہیں لیکن لطافت خیال سے بھی نہیں کٹتے یہی گداز جذبات ہیں۔ سلیم اختر کے افسانوں میں جہاں جذبات میں شدت دکھائی دیتی ہے تو ان کے ساتھ ساتھ نرمی، رحم دلی، درد، غم اور دکھ کے جذبات بھی ان کے افسانوں میں دکھائی دیتے ہیں

اور روح انسانی کے اندر پیدا ہونے والے نرم جذبات واضح انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ افسانہ "بے چراغ بستی کا چراغ" میں جس کی کہانی انتہا پسندی کے گرد گھومتی یعنی لوگ خود کو پاک قرار دے چکے ہیں اور کسی گناہ گار کی اس بستی میں جگہ نہیں ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار خود کو اس بے چراغ بستی کا نوحہ خواں سمجھتا ہے شاید اس کی آہ و زاریاں ان لوگوں کو روشنی دکھادیں جیسے :

> بس میں ہی بیچارا بچالیا گیا بے چراغ بستی میں چراغ جلانے کو۔ مردوں کی نوحہ گری کے لیے۔ تم جا سکتے تھے۔۔ کہاں۔۔ اور کیوں؟ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا یہ ان پاک لوگوں کی بستی تھی جو حد سے بڑی پاکیزگی ہی کے اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ میں ہی ان کے نوحہ کو باقی بچایا بچالیا گیا۔ مقدر سے فرار ممکن نہیں۔ یہ میرا مقدر ہے کہ بستی کو روشن رکھوں۔۔ کیوں؟ کھوکھلی ہنسی شاید ان کی بھٹکی ہوئی روحیں ایک دن اپنے ٹھکانوں پر واپس آنا چاہیں تو روشنی ان کی رہنمائی کرے گی۔ روحیں کہاں واپس آتی ہیں؟ جانتا ہوں جانتا ہوں۔۔ مگر پھر بھی۔۔ شاید نا ممکن۔۔ ممکن ہو جائے نا ممکن ممکن ہو جائے۔[۱۲]

اقتباس میں سلیم اختر مرکزی کردار کے ذریعے روح میں سما جانے والے دکھ اور کرب کو بیان کرتے ہیں کہ محبت اور روشنی کے اس چراغ کو دیکھ کر ہو سکتا ہے لوگ پلٹ آئیں۔ دراصل افسانہ نگار ہمدردانہ جذبات کے ذریعے اس حقیقت کو منکشف کرتے ہیں۔ نیکی کے عذاب میں مبتلا لوگ جو اپنے گناہوں کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو جاتے ہیں اور ان کے پاس دوسروں کے لیے معافی اور بخشش نہیں تو ایسے معاشرے آخر کار بے چراغ بستی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

سلیم اختر انسان کے اندر موجود رحم اور انسانیت کے جذبے کی جھلک اپنے افسانوں میں دکھاتے ہیں۔ افسانہ "سانتا کلاز" کے زوال میں معاشرے میں موجود لوگوں کے دکھ، درد، بے بسی اور بے چینی کو بیان کیا گیا ہے جیسے :

> شاعری کی کتاب نے میرے دل پر گہرے اثرات چھوڑے اور میں ہر وقت شعر کی دنیا میں رہنے لگا۔ تصور پرست اور تخیل مست۔۔۔ یوں میں شاعر بن گیا۔ حسن اور محبت کے گیت گانے والا۔ انسان کو انسان سمجھ کر سب سے محبت کرنے والا مگر یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ خرابی کیسے ہوئی؟ خرابی یوں ہوئی کہ میں ظالموں کی بستی کا شاعر تھا۔ ظلم پر مبنی معاشرہ میں انسان کی عظمت مساوات اور حقوق کا شاعر تھا۔ میں زندگی میں حسن، خوشی، نغمہ اور الفت کا شاعر مگر یہ باتیں بستی کے ظالموں کو خوش نہ آئیں جیسے جیسے پھولوں کی مہک کی مانند میرے

اشعار کی شہرت پھیل گئی ویسے ویسے ہی بستی کے ظالم میرے خلاف ہوتے گئے۔ حتی کہ ایک
دن مجھے بے دین اور باغی قرار دے کر بستی کا سکھ چین غارت کرنے کے جرم میں قید کر کے
تشدد سے مجھے اس حال کو پہنچا کر بستی سے باہر نکال دیا گیا۔ سانتا کلاز کا جھکا سر اوپر نہ اٹھ رہا تھا
اب میں اس راستے پر پڑا ہوں راہ کے پتھر کی مانند۔ [۱۳]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے غم اور دکھ اور بے بسی کے جذبات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری بھی اپنے دل میں اس دکھ کی چبھن محسوس کرتا ہے۔ دراصل سلیم اختر دکھ اور غم کے انداز میں سچائی کو سامنے لاتے ہیں۔ جس جگہ پر ظالموں کا راج ہو وہاں پر محبت، خوشی، امن، تلاش اور مساوات کی بات کرنے والے انسان کو ہمیشہ ہی ظلم کے ذریعے چپ کروا دیا جاتا ہے اور محبت کے پیامبر کا کوئی مددگار اور ساتھی نہیں ہوتا۔ جو لوگ معاشرے میں انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں ان کے حصے میں صرف غم، موت اور تشدد ہی آتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دکھ، درد، غم، خوشی، حیرت اطمینان وغیرہ ایسے جذبات اور کیفیات ہیں جن سے ہر انسان اپنی زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر اور مختلف اوقات میں روشناس ہوتا رہتا ہے۔ سلیم اختر اچانک سے پیش آجانے والے ان حادثات کا ذکر اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورتی اور دلچسپ انداز میں کرتے ہیں جیسے دکھ کی کیفیت اور جذبے کو انہوں ہونے افسانہ "آئینہ" کے شروع میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

اس نے آئینہ فرش پر دے مارا۔ اس کے لبوں سے ایک ایسی آواز نکلی جس پر بیک وقت دہشت
اور کراہت پوشیدہ تھی یہ۔۔ یہ۔ میں ہوں؟ اس نے شکستہ آئینے کے ٹکڑوں میں جیسے دوبارہ
جھانک کر تعجب کے ساتھ خود سے سوال کیا۔ پھر وہ اوندی لیٹی تکیے میں منہ دبا کے رو رہی تھی
وہ کافی دیر روتی رہی اور جب روتے روتے نڈھال سی ہو گئی اور سسکیاں لیتے لیتے گلے میں بھی
درد ہونے لگا تو وہ بے دم سی آنکھیں موندے پڑی رہی اور اسی حالت میں سو گئی۔ [۱۴]

اقتباس میں سلیم اختر نے دکھ، درد، بیزاری، نفرت اور خوف کے جذبات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ انسان جب اچانک کسی حادثے کا شکار ہو جائے اور اس کے جسمانی اعضا متاثر ہو جائیں تو وہ خود اذیتی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں اپنی ذات، بے زاری اور فرار کا جذبہ ابھر آتا ہے۔

سلیم اختر کے افسانوں میں نہ صرف دلچسپ باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں بلکہ لوگوں کے سیکھنے کے لیے بھی بہت سی باتیں ہیں۔ وہ اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعے لوگوں کی ہمت بندھاتے بھی نظر آتے ہیں اور تحریر میں یہ خوبی گداز ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ "سویٹ ہارٹ" بے حد اہمیت کا حامل ہے جس

میں موجود بعض الفاظ واقعتاً اتنے حقیقی اور سبق آموز ہیں کہ دل کو چھو لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انسان کے اندر گداز کی کیفیت پیدا کرتے ہیں جیسے:

> مجھے زندگی میں دو چیزوں کی تمنا ہے محبت وہ مجھے تم سے مل گئی اور عزت جو مجھے کبھی نہ مل سکے گی مگر میں تو۔۔ میں جانتی ہوں۔۔ میں جانتی ہوں۔ وہ خاموش ہو گئی میں نے کہا تم کہتی ہو تمہیں عزت کبھی نہ مل سکی لیکن تم بھولتی ہو کہ عزت داخلی چیز ہے۔ اگر تم اپنی عزت کر سکتی ہو تو تمہیں دنیا والوں کی زبان کا خیال نہ کرنا چاہیے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے اس میں تمہاری اپنی مرضی کا دخل نہ تھا تم اپنی آرزو اور تمناؤں کو عزت کی دکان پر بیچ رہی ہو۔ یہ دوسروں کے نزدیک تو بے عزتی کی بات ہو سکتی ہے مگر میرے نزدیک ایسا نہیں اور اسی لیے میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بولو کیا تمہارے دل میں کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا کہ تمہارا اپنا گھر ہو جس میں ہر چیز تمہاری پسند اور ذوق کے آئینہ دار ہو۔ تمہارے اپنے بچے ہوں پیارے پیارے۔ شور مچاتے۔ اور تمہارے پیچھے امی امی کرتے بھاگتے ہوئے بچے کیا تم۔۔ وہ ایک دم چیخ پڑی اوہ! فار گاڈ سیک! چپ ہو جاؤ۔۔ چپ ہو جاؤ!! اس کی آواز آنسوؤں کی دھار میں ڈوب گئی۔ اس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر سسک سسک کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے پیار سے اس کے گالوں کو سہلایا۔ ویلما! مجھے تمہارے احساسات کا اندازہ ہے اور میں ان کی قدر کرتا ہوں۔ میرا مقصد تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہ تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں اپنی محبت کا عملی ثبوت دینا چاہتا ہوں۔[۱۵]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے دکھ، درد، اور ہمدردی کے جذبات کے ذریعے ان عورتوں کے کرب اور بے بسی کو بیان کیا ہے جو پیشہ ور ناچ گانے والی نہیں ہوتی بلکہ حالت مجبوری اس دلدل میں پھنس جاتی ہیں اور اس تلخ سچائی سے باخبر ہوتی ہیں دنیا کبھی ان کو عزت نہیں دے گی اس دکھ بھری سوچ کے ساتھ ہی ایک باریک نقطے سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ عزت انسان کی شخصی و ذاتی شے ہے اگر انسان اپنا احترام خود کرتا ہے تو اس کو دنیا والوں کی پرواہ نہیں رکھنی چاہیے اور دوسرا جو مرد عورت سے سچی محبت رکھتا ہے تو وہ برائی کے باوجود اس سے نکاح کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔

سلیم اختر کے افسانوں میں گداز کی صفت ایک عجیب سی کشش پیدا کرتی ہے جو قاری کو اپنے حصار میں جکڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس لیے سلیم اختر اپنے افسانوں کا موضوع کوئی بھی رکھیں لیکن اس میں حقیقت کا

رنگ ضرور بھرتے ہیں جس سے انسان کو معاشرے اور سماج میں موجود حالات، لوگوں کے احساسات اور ان کے جذبات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس صورتحال کو افسانہ "گریز پا" میں کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔

> تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟ وہ اس کی جانب دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ اس دن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ بس پاگل ہو گیا تھا میں۔ اس نے خاموشی سے اس کے جسم کو دیکھا۔ میں دراصل یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے وہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ مگر میری یہ نیت نہ تھی میں تمہارے پاؤں توڑنا نہ چاہتا تھا میں تو تمہیں ڈرا رہا تھا۔ غلطی میری بھی تھی مجھے تمہیں گندی گندی گالیاں نہ دینی چاہیے تھیں۔ پھر بھی۔ پھر بھی۔ یہ سب نہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ دوبارہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ وہ پاؤں جو علاج کے بغیر زخمی تھے وہ پنڈلیاں جن کے زخموں میں پیپ پڑ رہی تھی اور وہ رانیں جو سوج رہی تھیں۔ چوک کے ایک کونے میں وہ چھوٹی سی ریڑی میں ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھی ہے لوگ اس کی جوانی دیکھتے ہیں پھر اس کی زخمی ٹانگیں اور ان پر بھنبھناتی مکھیاں تو رحم اور کراہت کے ملے جلے احساس سے ان کی جیبیں خود بخود پیسے اگل دیتی ہیں۔ اب اس کے باپ کو بھی اس کے پاس ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس کے مالک کو کیونکہ اسے بھی اور انہیں بھی علم ہے کہ وہ اب بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔[۱۶]

سلیم اختر نے اس طویل اقتباس میں ہمدردی، دکھ، بے بسی اور احساس شرمندگی کے جذبات بیان کرتے ہوئے پدرسرانہ سماج کی تلخی کو بیان کیا ہے کہ ایسا معاشرہ جس میں مرد کو فوقیت حاصل ہو ذرا سی غلطی پر عورت کو تشدد کا نشانہ بنا کر ہمیشہ کے لیے اپاہج کر دیتا ہے اور اس کے بعد شرمندہ ہو کر معافی کا طلب گار بھی بن جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کے دلوں میں یہ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ اب وہ دوبارہ بغاوت نہیں کر سکے گی۔

گداز کی کیفیت میں راحت اور دکھ ہر طرح کے جذبے کارفرما ہوتے ہیں۔ تحریر میں گداز صرف دکھ کے جذبات بیان کرنے سے پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ خوشی اور محبت کے جذبات بیان کرنے سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ افسانہ "ماں بیٹے" میں انہوں نے بیٹے اور ماں کے درمیان موجود رشتے کے احساسات اور جذبات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے جیسے:

> خاص طور پر اس وقت جب اسے بیٹے کی نظریں اپنے تعاقب میں محسوس ہوتیں۔ تم یوں گھور گھور کے کیا دیکھ رہے ہو؟ ماں تم اچھی جو لگتی ہو۔ یہ اچانک تعریف چہرے پر سرخی لے آئی۔ شت شیطان! سچ ماں! وہ اٹھلا کر بولتا۔ یہ نیلا سوٹ تو بہت ہی جچ رہا ہے۔ وہ اس تعریف سے

خوش بھی ہوتی اور چڑتی بھی۔ یہ تو ہر وقت کپڑوں کو کیوں دیکھتا رہتا ہے تو نے تو کپڑے بدلنے محال کر دیے ہیں۔ واہ بھئی ! اچھی رہی ایک تو کپڑوں کی تعریف کرو اور دوسری باتیں سنو۔ اس نیلے سوٹ میں بہت بری لگ رہی ہو اسے اتار کر دوسرا بدل لو۔ کون سا؟ وہ جیسے بے خیالی میں پوچھتی۔ وہی جس کی پیلی زمین پر لال اور سبز پھول ہیں۔ وہ آنکھیں نیچا کر کے جواب دیتا وہ ہنس کر کہتی تجھ سے نپٹنا بہت مشکل ہے۔[۱۷]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے محبت، پیار، لاڈ اور شرارت کے ذریعے تحریر میں گداز کا رنگ سمو دیا ہے۔ بیٹے کی ماں کے ساتھ محبت اور اس کا بے تکلفانہ اظہار تحریر میں خوشی کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔

اس طرح انسان کے جذبات میں خوشی کی کیفیت اور جذبات کا بڑا عمل دخل ہے۔ انسان کے اندر رحم اور انسانیت کا جذبہ بھی اس وقت زیادہ جلدی بیدار ہوتا ہے جب وہ بے حد خوش اور مطمئن ہو اور سلیم اختر اس رمز سے بخوبی واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں کہیں خوشی میں زور بیان کی صفت نظر آتی ہے تو کہیں گداز کی صفت نمایاں ہوتی ہے لیکن جو بھی کیفیت ہو وہ اپنے طرز بیان میں اسے بخوبی نبھاتے ہیں اور قاری کے سامنے کچھ اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اس میں قاری کے لیے کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کو سلیم اختر "افسانہ کا ناچور" میں اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

پھر ایک گھٹنا ٹیک کر لڑکی کے اڑتے بالوں اور پانی سے باہر نکلے آدھے سورج کو لیا۔ کلک ! سورج سونے کی ٹکیہ کی طرح منور تھا اور تا حد نگاہ سونا لہریں مار رہا تھا۔ جب ساحل پر آ کر جھاگ کے موتی ٹوٹتے تو قطروں میں رنگوں کے آنچل لہرا جاتے۔ خاور کے لیے تخلیقی سرشاری کے وہ لمحات تھے جب انسان تخلیق کار بن کر فطرت سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور خود میں خالق کی تخلیقی قوت محسوس کرتا ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر لہروں پر سونا ابھی تک بکھرا تھا۔ لڑکی نے پہلی مرتبہ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو اسے کیمرہ لیے پایا۔ پلیز مس ! خاور نے کیمرہ کا فوکس درست کر لیا۔ آں ؟ وہ حیرت سے بولی۔ کلک ! خاور نے بے اختیار ہو کر خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ چند منٹوں میں اس نے بہترین تصاویر حاصل کر لی تھیں وہ پاگلوں کی طرح چلا چلا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور شاید یہی کرتا اور تو نہیں کم از کم دیوانہ وار لہروں میں ہی کود جاتا۔[۱۸]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے خوشی کے جذبات کو تحریر میں سمو دیا ہے کیونکہ خوشی سے مراد انسان کی وہ کیفیت ہے جس میں فرحت کی حالت میں بدن کو حرکت دینے یا اچھلنے کودنے کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔ اس تحریر میں

وہ ایک فنکار کے اس خوشی بھرے جذبے کو پیش کیا ہے جس میں وہ اپنے فن کو کاملیت کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے اور شاہکار تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہر فنکار کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایسی تخلیق منظر عام پر لائے جس میں بناوٹ سے زیادہ قدرتی پہلو نمایاں ہو اور جب فنکار اس فن کے اس مرحلے تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنی منشا کو پا لیتا تو اس کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ وہ خوشی کے جذبات کا اظہار کھلم کھلا کرے اور اپنی زبان اور اپنے جسم کی حرکات و سکنات کے ذریعے اس خوشی کا عملی اظہار کریں تاکہ اس کی کامیابی کی خبر ارد گرد ماحول میں پھیل سکے۔ اسی طرح افسانے میں مزید مسرت کے لمحات کو بیان کرتے ہیں:

> پھر وہ ان کے گھر گیا اور بالآخر اسے دلہن بنا کر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ تب ایک دن خاور نے اس سے کہا خوش قسمتی کے بھی کوئی روپ ہیں مگر مجھے یہ سیکسی سوزن کے روپ میں ملی ہے۔ وہ یہ سن کر خوشی سے کھل اٹھی۔ وہ سوزن تھی یا نہیں یہ تو الگ بات ہے لیکن اس کے سیکسی ہونے میں دونوں کو کوئی شبہ نہ تھا۔ بہت محبت کرنے والی بہت محنت کرنے والی مگر رات کو بستر پر مکمل طور سے خراج وصول کرنے والی عورت تھی۔ خاور اس کی تصویریں اتارتا نہ تھکتا تھا۔ جب ہر لباس اور ہر پوز میں تصویر بنا چکا تو پھر کم لباس اور بعد ازاں بے لباسی میں تصویریں بنا ڈالیں۔ گو اس نے اخلاقاً انکار کیا مگر وہ اپنے جسم کی سب سے بڑی عاشق خود تھی۔ خاور سے بھی بڑھ کر اور یہ اس کی نرگسیت کی تسکین کا ایک خوبصورت انداز ہے ان تصویروں کو ہمیشہ تالے میں رکھا جاتا اور جب دونوں موج میں آتے تو یہ خفیہ البم کھول بیٹھتے۔ کبھی یہ تصویریں تحریک کا باعث بنتی ہیں تو کبھی ٹانک کا کام کرتیں۔[19]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے خوش قسمتی، تعریف، سکون، جنسی تحریک خوشی اور نرگسیت کے جذبات تحریر میں سمو کر گداز کی صفت نمایاں کی ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے جب اسے من پسند شے مل جاتی ہے تو وہ اس کو اپنی قسمت کہہ کر اپنی ذات کو خوش کرتا ہے اور جب انسان اپنی تعریف سنتا ہے تو خوشی کا بھرپور تاثر دیتا ہے اور اپنی ذات سے محبت بھی انسان کو سکون فراہم کرتی ہے کیونکہ "فرائیڈ کے مطابق نرگسیت (Narcissism) میں مبتلا فرد غیر شعوری سطح پر اپنی محبت کا شکار ہو جاتا ہے۔ نرگسیت میں مبتلا فرد وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ سے عشق کرتا ہے۔[20]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے افسانوی کردار کے ذریعے اپنی ذات سے محبت کا احساس نمایاں کیا جو کہ سکون کا باعث ہے یہ لطیف جذبات گداز کی صفت کی عکاسی کرتے ہیں۔ سلیم اختر کے افسانوں میں عورت کا کردار بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے وہ اپنے افسانوں میں نفسیاتی اعتبار سے عورت کے کردار کو ڈھالتے ہیں جو کہ ایک عجیب و

غریب وجود بن کر رہ گئی۔ شاید اس لیے بھی وہ اپنے افسانوں کے ذریعے حقیقت کی عکاسی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ افسانہ "جلے پاؤں کی بلی" کا موضوع صنفی تقسیم ہے۔ جس میں مرد کو عورت پر فوقیت دی جاتی ہے اور عورت کو معاشرتی رویے سے یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ سکون اور اطمینان مرد ہونے کی صورت میں ہی میسر آ سکتا ہے جیسے:

> اب وہ پر سکون تھی۔ دل کی دھڑکن تھم چکی تھی اور سانس میں تیزی نہ رہی تھی۔ یہ پھیلی ہوئی پتلیاں اب اصل حالت پر تھیں۔ آئینہ میں ایک سکھ لڑکا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پیشانی پر جھکی ایک لٹ کو کھینچ کر پیچھے کر دیا۔ قمیض کا آدھا کالر بلیزر کے اندر تھا اور آدھا باہر۔ اس نے کالر کو بلیزر کے کالر کے اوپر ٹھیک کیا۔ سرخ بلیزر زرد رنگ پر خوب پھب رہا تھا۔ پیتل کے چمکیلے بٹنوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو ان کی ٹھنڈک نے جھنجھنائے اعصاب کو عجب سکون دیا۔ چھاتیاں کیونکہ بڑی نہ تھیں اس لیے بلیزر کے بٹن بند کر دینے سے وہ بالکل دب گئیں۔ پتلون کے بٹن بند کرتے وقت سکھ لڑکا مسکرا دیا دنیا مسکرا دی کائنات کھلکھلا اٹھی۔ [۲۱]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے مرکزی کردار کو مرد کا روپ اختیار کر کے خود کو نفسیاتی سطح پر مطمئن اور پر سکون کرنے کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے گداز کی صفت کو تحریر میں نمایاں کیا ہے۔ کیوں کہ گداز اطمینان سکون اور خوشی کی کیفیت کو بھی کہتے ہیں اور معاشرے کی اس خامی کی طرف اشارہ کیا کہ عائلی زندگی میں بچیوں کی تربیت اس انداز میں کی جا رہی ہے کہ ان کے نزدیک مرد ہونا ہی معاشرے میں عزت اعتماد اور خوشی کا نام ہے۔

ان اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ سلیم اختر نے گداز کے دونوں ہی رنگ غم، درد، تکلیف، بے چینی اور خوشی، اطمینان، سکون اپنی افسانوی نثر میں سمو دیے ہیں۔ عابد علی عابد نے جذباتی صفات میں مزاح کو بھی شامل کیا ہے۔ اب سلیم اختر کی افسانوی نثر کا جائزہ جذباتی صفت مزاح کے تحت لیا جائے گا۔

مزاح:

مزاح جو انداز کی صفات جذباتی میں شمار ہوتا ہے اس حوالے سے بات کرتے ہوئے عابد علی عابد ہجو شخصی کو خارج کرتے ہیں کہ عموماً یہ ادبی معیار پر پوری نہیں اترتی جبکہ مزاح کے متعلق بیان کرتے ہوئے وائلڈ کی انگریزی لغت کو اہمیت دیتے ہیں۔ جس کے مطابق "خندہ آور شے کا شعور، بیہودہ اور بے ثمر باتوں پر ہنسنے کا ملکہ، نرم نرم زبان میں بیہودگیوں کی طرف اشارہ کرنا، بشرطیکہ اس میں ہمدردی شامل ہو۔" [۲۲]

جب کہ چیمبر کی لغت بیسویں صدی میں اس حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ "ایک ملکہ ذہنی جو عجب اور خندہ آور چیزوں کا شعور کرتا ہے، ان سے مسرت حاصل کرتا اور ہمدردانہ ان پر ہنسنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" [23]

طنز کے متعلق وائلڈ لکھتا ہے کہ

> کوئی ایسا فن پارہ جس میں انسانی کمزوریوں اور بیہودگیوں کو آئینہ دکھایا جائے، ریاکاری کی مذمت کی جائے اور ایسے معاشرے کی سخت اہانت کی جائے جس میں برائیاں اور ریاکاریاں راہ پاگئی ہوں۔ [24]

اسی طرح Irony کا لفظ بھی طنز کے دائرے میں ہی مل جاتا ہے تاہم وائلڈ نے علیحدہ لکھا ہے۔ "الفاظ کو اس طرح استعمال کرنا کہ ان سے مزاح اور تمسخر کی بو آئے، نہیں کہنا اور ہاں مراد لینا۔ [25]

یعنی کہ مزاح سے مراد بے فیض اور بے مقصد باتوں پر ہنسنے کا ہنر جس میں ہمدردی کا پہلو شامل ہے جب کہ طنز میں معاشرے کی اصلاح مقصود ہے جب کہ عام طور پر اس کے معنی طعنہ یا چھیڑ کے لیے جاتے ہیں۔ طنز و مزاح کی ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ اس میں لطیف جذبات کی ملاوٹ ہوتی ہے۔

سلیم اختر کے افسانوں میں طنز و مزاح کی بات کی جائے تو ان کے اسلوب میں بہت زیادہ تو نہیں لیکن بہت حد تک طنز و مزاح کا تاثر موجود ہے جس سے اسلوب کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ قاری کے لیے مزاح اور طنز کا جذبہ اور کیفیت ایک دلچسپ شے ہے جسے پڑھ کر قاری کو افسانے یا کہانی میں ایک خاص قسم کا لطف محسوس ہوتا ہے۔

افسانہ "چالیس منٹ کی عورت" کا آغاز بھی بڑے مزاحیہ انداز میں ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے:

> بیک وقت نیچے جھکنے سے ہم دونوں کے سر ٹکرا گئے اور ایک ہی سیفٹی بیلٹ ہمارے ہاتھ میں تھی۔ وہ زور زور سے ہنسی اور انگریزی میں یہ تو بالکل کسی فلم کے مانند ہے مگر عمر کے غلط دور میں میں نے جواب دیا۔ وہ دوبارہ ہنستی ہے اور تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ابھی تک ہم دونوں اسی سیفٹی بیلٹ کو پکڑے ہوئے تھے۔ [26]

ویکیپیڈیا Wikipedia کے مطابق "مزاح ایک ایسا رجحان ہے جس میں ہنسی کو بڑے لطیف انداز میں لوگوں، محفلوں اور موقعوں کے بیچ جگہ دی جاتی ہے۔ [27]

لہذا اس اقتباس میں سلیم اختر نے لطیف سے جذبے کو مزاح کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ فلمی انداز میں حسین اور خوبصورت ٹکراؤ جس نے چہرے پر خوشی بکھیر دی ہے عمر کے غلط حصے میں ہوا ہے۔ مزاح کا بنیادی مقصد

بے کار اور بے مقصد باتوں پر اس طرح ہنسنا جس میں ایک دوسرے کی تضحیک کا پہلو شامل نہ ہو جو دونوں افراد کے لیے خوشی کا باعث بنے۔ اسی طرح مزید اس افسانے میں مزاح کا پہلو دکھائی دیتا ہے جیسے:

> وہ پرس میں سے ٹشو پیپر نکال کر پسینہ پونچھتی اور معذرت کرتی ہے کیوں کیا ہوا؟ وہ میں ۔۔۔۔۔ وہ میں نے ہاتھ جو پکڑ رکھا تھا۔ اچھا؟ میں انجان بننے کی اداکاری کرتا ہوں۔ وہ تو میں نے آپ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا تو مجھے ڈر جو لگ رہا تھا۔ وہ ہنستی ہے۔ یو ناٹی بوائے۔ "نو میڈم میں ناٹی تو ہو سکتا ہوں مگر بوائے ہر گز نہیں۔ اس لیے ناٹی اولڈ مین زیادہ مناسب رہے گا۔" میں سر کے سفید بالوں میں مبالغہ آمیز انداز میں انگلیاں پھیرتا ہوں۔ وہ قہقہہ لگاتی ہے۔[۲۸]

کانٹ Kant کے مطابق "ہنسی اس وقت وجود میں آتی ہے جب کوئی چیز ہوتے ہوتے رہ جائے۔"[۲۹]

لہذا اس اقتباس میں سلیم اختر ہلکے پھلکے انداز میں مزاح کا رنگ تحریر میں سموتے ہیں کہ میری عمر کا تقاضا یہ ہے کہ میں ناٹی تو ہو سکتا ہوں لیکن بوائے تو ہر گز نہیں۔ اس طرح کے مکالماتی انداز کو پڑھ کر قاری کے چہرے پر بھی ہنسی بکھر جاتی ہے اور تحریر میں مزاح کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ مزاح ہشاش بشاش ہو جائے اور انسان اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرے۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی ہنسنا بہت ضروری ہے اس کی وجہ سے جسمانی فائدے میسر آتے ہیں بلکہ ذہن کی کارکردگی بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ ادب زندگی کے ہر حصے کے اتار چڑھاو کی عکاسی کرتا ہے۔ ہنسی بھی انسانی زندگی کا ایک اہم جزو ہے اس لیے ادب ہنسی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس لیے لطیف انداز بیاں کو پڑھ کر راحت کا احساس ہوتا ہے۔ دماغ پر سے دباؤ ہٹ جاتا ہے۔

سلیم اختر افسانہ "دو سیارے" میں روزمرہ کی گفتگو میں مزاح کا رنگ پیش کرتے ہیں۔ جیسے:

> آپ تو ایسے بھاگ رہے تھے جیسے جیسے۔۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ" میں فقرہ مکمل کر دیتا ہوں۔ وہ ہنستی ہوئی احتجاج کرتی ہے۔ میں یہ نہیں کہنے والی تھی۔ میں تو یہ کہنے والی تھی جیسے استانی سے شاگرد بھاگتا ہے۔[۳۰]

سلیم اختر عام بول چال میں محاورہ کا اس قدر خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں کہ ماحول کا دباؤ اور تلخی ختم ہو جاتی اور خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ محفل سے بھاگنے کو گدھے کے سر سے سینگ کے ساتھ تشبیہ دے کر اور استانی سے شاگرد کی مثال دے کر تحریر میں خوشی کا عنصر پیدا کر دیا ہے کیوں کہ مزاح کا اصل مقصد ناپسندیدہ

چیزوں کے اثرات کو ختم کر کے خوش گوار ماحول کو پیدا کرنا ہے کیوں کہ مزاح کی وجہ سے انسان تر و تازہ ہو جاتا ہے اور کچھ لمحات کے لیے زندگی کے نشیب و فراز کو بھول کر ان الفاظ کی خوشی کو محسوس کرتا ہے۔

سلیم اختر افسانہ "کانا چور" میں مزاح کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ اس میں ادھوری خواہشوں کی تکمیل کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ جیسے

> ایک دن چاؤ میں آ کر بولا۔ اگر یہ تصویر میں "پلے بوائے" یا کسی ایسے ہی امریکی پرچے کو بھیج دوں تو ہزاروں ڈالر کی صورت میں زر مبادلہ کما سکتا ہوں۔ وہ ہنس کر بولی مگر اس زر مبادلہ کو ڈکلیر نہ کرنا۔ ہاں وہ ہنس کر بولا۔ پھر اس طرح ہم سرمایہ دار بن جائیں گے اور پھر تم اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول لینا۔ اپنی کیوں؟ بیگ صاحب کی ایجنسی ہی خرید لیں گے۔ میں اس ایجنسی کی فوٹو گرافر بنوں گی۔ وہ خوب ہنساہاں، کیوں میں میل ماڈلز کی تصویریں اتاروں گی۔[۳۱]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے لاحاصل خواہشوں کی تکمیل کے خوبصورت احساس کے ذریعے ہلکے پھلکے انداز میں مزاح کے رنگ کو تحریر میں پیش کیا ہے۔ مذاق میں دولت کا حصول، کمپنی کی ملکیت، دل کی تمنا کا احساس، خوشی کا جذبہ بیدار کر رہا ہے۔ مزاح میں محبت کا جذبہ غالب ہوتا ہے اور اس سے افراد کے درمیان ایک مضبوط رشتہ استوار ہوتا ہے۔

سلیم اختر افسانہ "ماں بیٹا" میں محبت کے جذبے کے ساتھ رنگے ہوئے مزاح کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جیسے:

> چھوڑو ماں یہ کیا ہر وقت شادی شادی کرتی رہتی ہو، شادی نہ کرو گے تو پھر کیا کرو گے؟ کیا مطلب پھر کیا کرو گے۔ ماں آخر اب میں کیا کر رہا ہوں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تو پھر؟ اب جوان ہوا اچھے رشتے مل رہے ہیں۔ کل کلاں یہ سب بیاہی گئیں تو میں کہاں سے لڑکیاں لاؤں گی۔ وہ ہنسا ماں لڑکیاں جب چاہو لے لو۔ اس ملک میں لڑکیوں کی بڑی اکثریت ہے اور اچھے لڑکوں کا کال ہے۔ وہ اس کے ایک دھپ لگاتی۔ اس اچھے لڑکے کی بو تھی تو دیکھو۔ ایسی خاص۔ ---- بری بھی نہیں۔"[۳۲]

ڈاکٹر روف پاریکھ مزاح کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "کسی عمل، خیال، صورت حال، واقعے، لفظ یا جملے کے خندہ آور پہلوؤں کو دریافت کرنا سمجھنا اور ان سے محظوظ ہونا مزاح ہے۔"[۳۳]

لہذا سلیم اختر بھی ماں اور بیٹے کے درمیان ہونے والی جذباتی گفتگو کو مزاح کا رنگ دے کر پیش کرتے

ہیں کہ اس معاشرے میں لڑکیوں کی نہیں بلکہ اچھے لڑکوں کی کمی ہے۔ اسی طرح اس افسانے میں ماں اور بیٹے کی گفتگو کے دوران مزید مزاح کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

> واہ بھئی اچھی رہی ایک تو کپڑوں کی تعریف کرو اور دوسرے باتیں سنو۔ اچھا اس نیلے سوٹ میں بہت بری لگ رہی ہو۔ اسے اتار کر دوسرے بدل لو۔ کون سا؟ وہ جیسے بے خیالی میں پوچھتی وہی جس کی پیلی زمین پر لال اور سبز پھول ہیں۔ وہ آنکھیں نچا کر جواب دیتا۔ وہ ہنس کر کہتی تجھ سے نپٹنا بہت مشکل ہے۔ [۳۴]

برگساں کے مطابق "زندگی لچک اور تحرک سے عبارت ہے اور زندگی جب کسی مقام پر جامد ہو جائے اور میکانکی عمل کا نقشہ دکھائے تو ہماری ہنسی کو تحریک ملتی ہے۔ بے ربط اور بے ہنگم چیزیں بھی ہنسی کا باعث بنتی ہیں۔" [۳۵]

لہذا سلیم اختر بھی اس اقتباس میں زندگی کے جمود کو توڑ کر اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کو مزاح کے انداز میں پیش کرتے ہیں کیوں کہ بیٹا اپنی بیوہ ماں کو رنگین اور خوش نما لباس میں زندگی کے ساتھ بھرپور خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اور بیٹے کا یہ انداز ماں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے اور قاری بھی اس محبت بھرے انداز کو پڑھ کر خوشی کی لہر کو محسوس کرتا ہے۔

مزاح کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ پریشانی اور دباؤ کے وقت دماغ کو ہلکا پھلکا کرنے کا باعث بنتی ہے اور انسان کے دل سے ناسازگار حالات و واقعات کی دہشت کو کم کر دیتی ہے۔

سلیم اختر افسانہ "سائے کی طرح ساتھ پھریں" میں اسی انداز میں مزاح کے رنگ کو پیش کرتے ہیں۔

> دونوں خاموشی سے نکلے۔ ماں کے چہرے پر پریشانی تھی۔ ادھر سینگوں نے اسے دھلا دیا تھا۔ کیا کہا تھا؟ وہ ایک لمحہ خاموش رہی، سر اٹھایا تو پریشان نظر میں بیٹے کا چہرہ ٹٹول رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ بولی تم پر سایہ ہے کیا؟ ایسی باتیں تو دوسرے کے بارے میں کی جاتی ہیں یا ایسے واقعات کہانیوں میں پڑھنے کو ہوتے ہیں۔ یہ خود پر بیتنے والی باتیں تو نہیں۔ سایہ اور مجھ پر؟ وہ تنک کر بولا۔ کیوں تم کوئی بھوت ہو کہ تم پر سایہ نہیں ہو سکتا۔ اپنی بات پر خود ہی ہنس دی۔ یوں اعصابی تناؤ میں قدرے کمی ہو گئی۔ پیر صاحب کا خیال ہے کہ دونوں وقت ملتے تم کسی درخت کے نیچے رکے ہو جہاں کوئی آسیب ماں اس نے ہنس کر بات کاٹی، وہ پری بھی تو ہو سکتی ہے۔ [۳۶]

ڈاکٹر احسن فاروقی کے مطابق: "مزاح جنت کی سہانی فضا ہے جس میں رات کی تاریکی ہے نہ دوپہر کی

تمازت، نسیم کے نرم نرم جھونکے آرہے ہیں اور فرحت بخش رہے ہیں۔ [۳۷]

لہذا سلیم اختر بھی اس پیرائے میں مزاح کے ذریعے خوف اور پریشانی کی تاریکی کو ختم کر کے خوشی کا احساس بیدار کر رہے ہیں۔ ماں بیٹا پریشانی کے عالم میں بھوت اور پری کا ذکر کر کے خود ہی مسکرا پڑتے ہیں اور قاری بھی اس سنسنی خیز منظر میں ہنسی کے لمحات پڑھ کر مسکرا اٹھتا ہے۔

مزاح کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان میں ایسی قوت پیدا کرتی ہے کہ وہ صدمے کی حالت میں بھی ہنس کھیل کر آگے بڑھنے کی قوت پیدا کر دیتی ہے۔ سلیم اختر افسانہ " جلے پاؤں کی بلی " میں مرکزی کردار کی عائلی زندگی میں غیر مساوی سلوک کی وجہ سے یہ صدمہ اس کی روح میں پیوست ہو گیا ہے کہ وہ مرد کیوں نہیں ہے۔ مرد بننے کی ہر ممکن کوشش کرتی اور عورت کی جسمانی ساخت سے بیزار ہے۔ اور اس کا مذاق بھی بھرپور طریقے سے اڑاتی ہے۔ جیسے :

> اس پر بروکیڈ کی شیروانی میں ملبوس اور آئی برو پنسل سے تلوار مار کہ مونچھیں بنائے شہزادہ بولی۔ اے میاں وزیر زرا میری شہزادی سے دور ہی رہو۔ شہزادی کی شیروانی سے چھاتیوں کے ابھار کا اندازہ ہوتا تھا۔ نعیمہ نے فوراً چوٹ کی۔ میاں شہزادے۔ اپنا ٹریڈ مارک تو سنبھالو۔ اس پر خوب قہقہہ لگا۔ [۳۸]

ایسٹ مین مزاح کے اصول وضع کرتے ہوئے کہتا ہے کہ " بالغوں میں ہنسی کھیل کا یہ رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے لہذا وہ ناخوشگوار اشیاء کو مزاحیہ رنگ میں دیکھتے اور ان سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ " [۳۹]

لہذا اس اقتباس میں سلیم اختر مرکزی کردار نعیمہ کی ناپسندیدہ شے یعنی عورت کے سینے کے ابھار کو ٹریڈ مارک کہہ کر مزاح کا رنگ پیش کرتے ہیں۔ مزاح کی یہ خوبی ہے کہ وہ انسان کے اندرونی دباؤ کو کم کر کے اسے ہلکا پھلکا کر دیتی ہے۔

مزاح ایک لطیف جذبہ ہے جو ہمارے روزمرہ کے حالات و واقعات میں مسرت کا اضافہ کر دیتا ہے۔ جیسے سلیم اختر افسانہ " نقلی چوکیدار " میں باپ بیٹی کی گفتگو سے مزاح کا عنصر پیدا کرتے ہیں۔

> الف آم، ب بکری، پ پنکھا ہائیں نجمہ تم تو سارا قاعدہ غلط پڑھ رہی ہو۔ وہ کیسے ؟ سنو اصل قاعدہ یوں ہے۔ الف ابو وہ زور سے ہنستی اور ب سے۔۔۔ ب سے تمہاری امی۔ وہ کیسے ؟ امی بکری ہی تو ہے۔ ہاہاوہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ [۴۰]

وزیر آغا کے مطابق "مزاح کا پہلا حربہ موازنہ (Comparison) ہے۔ دو چیزوں کی آپس میں بیک وقت مشابہت اور تضاد سے وہ ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں جو ہنسی کو بیدار کرنے میں مدد دیتی ہیں۔"[۴۱]

لہذا سلیم اختر بھی اس اقتباس میں موازنے کے ذریعے تحریر میں مزاح کا رنگ پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے بیوی کو بکری کے ساتھ تشبیہ دے کر ہنسی کا عنصر پیدا کیا ہے۔

سلیم اختر کا افسانہ "توتا کہانی" میں بھی مزاح کا عنصر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس کہانی کا ماحول داستان کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

> سنو میری دکھ بھری داستان" طوطا بولا۔ میں ایک ملک کا شہزادہ تھا۔ حسین و جمیل ایک پری کی محبت میں گرفتار مگر ایک دیو پلید بھی اس پری کا خواستگار تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے جادو کی ایک انگوٹھی سے مجھ پر غلبہ پا کر مجھے طوطا بنا دیا۔ وہ منہ کھولے سن رہی تھی۔ اور اس پری کا نام؟ "سبز پری" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ آخر طوطے ہی رہے ناں عشق کیا تو سبز پری سے۔"[۴۲]

The New Caxton Encyclopedia کے مطابق: "اشیاء کا ظریفانہ پہلو دیکھنے کا نام مزاح ہے۔"[۴۳]

لہذا سلیم اختر بھی اس اقتباس میں مکالماتی انداز میں طوطے کے رنگ و روپ اور اس کی ذات و پسند کے ذریعے تحریر میں مزاح کا رنگ پیش کرتے ہیں۔ مزاح کا مقصد ہی یہی ہے کہ عام سی بات کے ذریعے قاری کو خوشی کا احساس میسر کر دیا جائے۔ اسی طرح سلیم اختر افسانہ "سیاہ حاشیہ" میں مزاح کا رنگ پیش کرتے ہیں:

> میری تصویریں اس قابل کہاں اور اب تو خیر ویسے بھی کافی عرصہ سے کوئی تصویر نہیں بنا سکی۔ کیوں؟ ایسے ہی بس ایسے ہی! میری بیوی یوں ایسے ہی تکلف فرما رہی ہیں صاحبہ! جس طرح بعض ڈاکٹروں اور حکیموں کے ہاتھوں میں شفا ہوتی ہے اسی طرح بعض ہاتھوں میں فن کاری ہوتی ہے۔ اچھا؟ میں بناوٹی تعجب سے بولا ذرا اپنے ہاتھ تو دکھاؤ۔ اس نے مسکرا کر ہاتھ میرے سامنے کر دیئے ہاں بھئی واقعی کمال کے ہاتھ ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ان میں چار انگلیاں ہیں ایک انگوٹھا اور ہائیں۔۔۔۔ ایک کلائی بھی تو ہے! سب نے قہقہہ لگایا۔[۴۴]

Practical English to English & Urdu dictionary کے مطابق مزاح سے مراد: "تقریر یا عمل سے خوش کر دینے کی اہلیت۔"[۴۵]

لہذا اس اقتباس میں بھی سلیم اختر مکالماتی انداز میں اداسی کا عنصر ختم کر کے لبوں پر مسکراہٹ اور خوشی

کے رنگ بکھیر دیتے ہیں۔۔ مزاح کا اولین مقصد یہی ہے کہ انسان خود بھی خوش ہو اور دوسروں کو بھی خوش کر سکے۔ اس طرح وہ اپنے اندر موجود غموں، دکھوں، پریشانیوں، الجھنوں، تکلیفوں، ماحولیاتی دباؤ، گھریلو دباؤ غرض ہر وہ شے جو اس کی سوچ کو منتشر کرنے کا باعث بنے ان سب کو محو کر کے کھلکھلا کر ہنس سکے۔ اسی طرح سلیم اختر کی افسانوی نثر میں طنز کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے جس میں وہ معاشرتی برائیوں کا عکس پیش کرتے ہیں۔

افسانہ "رزق حلال" میں وہ اسلامیات کے ماسٹر کی سخت گیری کے اثرات کو بیان کرتے ہیں۔

> اب میں ماسٹر کرم داد کو یہ کیسے بتاتا کہ ان کی خشونت، ان کے بھاری ہاتھوں اور گالیوں نے مجھے دینیات ہی سے نہیں بلکہ مذہب سے بھی بیزار کر دیا۔ میں باقی مضامین کی جماعتوں میں مانیٹر تھا لیکن دینیات کی کلاس میں چوہا بن کر پیچھے دبکا رہتا۔[۴۶]

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش نے اعلیٰ قسم کے مزاح کی مختلف شکلیں بیان کی ہیں۔

> جن میں طنزیہ مزاح سے مراد ایسا مزاح کسی خاص مقصد کے زیر تحت وجود میں آتا ہے۔ اپنے اندر طنز کا خفیف سا نشتر لئے ہوتا ہے تاکہ قاری اپنا نقشہ کسی بھی مضحکہ خیز یا غیر فطری حالت میں دیکھنے کے باوجود اداس نہ ہو۔[۴۷]

طنز سے عام طور پر مراد ٹھٹھہ یا تمسخر لیا جاتا ہے لیکن وائلڈ کے مطابق معاشرے کی اصلاح مقصود ہے۔ لہذا اس اقتباس میں سلیم اختر مزاح کے انداز میں ہلکا سا طنز کا عنصر شامل کرتے ہوئے سخت گیر اسلام کے ٹھیکیدار استادوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ ان کی سختی اور شخصیت کے کٹر پن اور بدزبانی کی وجہ سے طالب علم مذہب سے دوری اختیار کر لیتے ہیں جو کہ قابل مذمت شے ہے۔ اس صورت حال کو ظاہر کرنے کے لیے چوہا بطور استعارہ استعمال کیا ہے یعنی طالب علم اسلام کی طرف راغب ہونے کی بجائے عدم اعتماد اور خوف کا شکار ہو رہے ہیں۔ اسی طرح مزید اس افسانے میں مزید اس صورتحال کو ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے: "اس دن کے بعد سے دینیات کے پیریڈ میں مجھے کبھی کچھ نہیں کہا گیا۔ ویسے میں بھی مسلمان بن کر سکول جاتا لیکن پھر بھی مسلمان نہ بن سکا۔"[۴۸]

سلیم اختر اس اقتباس میں بھی مزاح کے انداز میں طنز کو تحریر میں شامل کرتے ہیں کہ جو استاد طالب علموں کے لباس پر تنقید کرتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طالب علم لباس تو مسلمانوں والا پہن لیتے ہیں لیکن وہ عملی طور پر کبھی مسلمان نہیں بن سکتے۔ اسی طرح مزید اس افسانے میں استاد صاحب کی رزق حلال کی تفسیر پہ اور ان کی شخصیت کے دوہرے پن پر طنز کیا ہے۔

آپ نے انکار کر دیا ہو گا۔ ہاں کیا تو تھا لیکن بعد میں سوچا کہ فلمی رسالے اور گانے بیچنے کے باوجود میرا کردار داغ دار نہیں ہو سکتا بلکہ میں ان سینما والوں کو بھی دکھا دوں گا کہ گندے ماحول میں خود کو کیسے پاک صاف رکھا جا سکتا ہے اور میں نے یہ کر دکھایا۔ گانے بھی بیچے اور نماز بھی نہ قضا کی۔ اس کام سے میں نے خاصا کمایا۔ پھر ایک اور سینما کے بھی سٹال کا ٹھیکہ لے لیا اور اللہ کے فضل سے بہت اچھی گزر ہونے لگی۔"[۴۹]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے ماسٹر صاحب کی گفتگو کے ذریعے ان کی دہری شخصیت پر طنز کیا ہے۔ جو ماسٹر تمام عمر طالب علموں پر سختی کرتا رہا اور مذہب کے نام پر لباس پر بھی تنقید کرتا تھا لیکن آج فحش مواد کو بیچ کر رزق حلال کما رہا ہے اور اس پر خدا کا فضل بھی کہہ رہا ہے اور خود کو پاک رکھنے کے لیے نماز کا پابند بھی ہے۔ سلیم اختر کا مقصد ایسے تمام استادوں کی مذمت کرنا ہے جو تعلیمی سطح پر تو دین کا پرچار کرتے ہیں لیکن عملی سطح پر ان کی شخصیت متضاد ہے۔ قول اور فعل میں بھی فرق ہے۔

اسی طرح سلیم اختر افسانہ "درد کا بندھن" میں ساس بہو کی ناچاقی پر طنز کرتے ہیں۔ جیسے:

اماں ہوں۔ مجھے ایک بات کا جواب دو۔ کیا؟ جمیلہ کو کس نے پسند کیا؟" میں نے "شادی کس نے کی؟ میں نے تو پھر آپ اس سے ناراض کیوں رہتی ہیں؟ میں ناراض تو نہیں رہتی۔ تو پھر یہ جھگڑا کیسا رہتا ہے؟ مجھے اس کی عادتیں پسند نہیں۔ کیسی عادتیں؟ بس ہر وقت بنی ٹھنی گڑیا بنی رہتی ہے۔ اماں اس کی شادی کو چند ماہ ہی تو گزرے ہیں۔ یہی دن تو عورتوں کے کھانے پینے کے ہوتے ہیں۔ چند مہینے؟ سال ہو چلا ہے!

"چلو سال ہی سہی" بس مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ ویسے اسے میں نے کہا تھا کہ گھر میں صاف ستھرے کپڑے پہنا کرے۔ گندے کپڑوں میں کیا اچھی لگے۔"[۵۰]

اس اقتباس میں سلیم اختر ساس کے رویے پر طنز کرتے ہیں کہ بہو جب شوہر کی خواہش کے مطابق گھر میں بن سنور کر رہتی ہے تو ساس اس کو ناپسند کرتی ہے جب کہ بہو کا انتخاب اور شادی دونوں کام اس نے اپنی مرضی سے کروائے ہیں لیکن اب عدم برداشت کا شکار ہے۔ سلیم اختر اس طنز میں ایک باریک نقطہ بھی بیان کرتے ہیں ماں کے ایسے رویے پر بہو کے بجائے اس کے اپنے بیٹے کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ پریشان رہتا ہے۔

درج بالا اقتباسات میں سلیم اختر کی افسانوی نثر کے اسلوب کا جائزہ جذباتی صفات "مزاح" کے تناظر میں لیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر،کڑوے بادام(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۲۔

۲۔ ایضاً، ص ۴۸۔

۳۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۴۔ ایضاً، ص ۵۳۔

۵۔ ایضاً، ص ۶۰۔

۶۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۷۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۸۔ سلیم اختر، چالیس منٹ کی عورت(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۱۳۔

۹۔ سلیم اختر، آدھی رات کی مخلوق(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۶۷۔

۱۰۔ سلیم اختر،کاٹھ کی عورتیں(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۵۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۱۲۔ سلیم اختر، مٹھی بھر سانپ(کتاب پوائنٹ بلاگ پوسٹ)، ص ۲۶۔

۱۳۔ سلیم اختر، آدھی رات کی مخلوق، ص ۶۹ ۔

۱۴۔ سلیم اختر، کڑوے بادام، ص ۷۸ ۔

۱۵۔ سلیم اختر ،کاٹھ کی عورتیں، ص ۴۴۔

۱۶۔ سلیم اختر ، کڑوے بادام، ص ۴۹۔

۱۷۔ سلیم اختر،،کڑوے بادام، ص ۷۳۔

۱۸۔ سلیم اختر، کاٹھ کی عورتیں، ص ۵۶۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۹۔

۲۰۔ نرگسیت http://wwwurdunotes.com/lesson/ تاریخ ملاحظہ ۱۲اپریل ۲۰۲۳ء،

بوقت ۱۱:۰۰ بجے۔

۲۱۔ سلیم اختر، کاٹھ کی عورتیں، ص۱۱۶۔

۲۲۔ سید عابد علی عابد، اسلوب (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۶ء)، ص۱۶۱۔

۲۳۔ ایضاً، ص۱۶۱۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۶۲۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۶۲۔

۲۶۔ سلیم اختر ، چالیس منٹ کی عورت، ص۷۔

۲۷۔ مزاح/http://www.wekipedia.org/wiki، تاریخ ملاحظہ ۱۲ اپریل ۲۰۲۳ء
بوقت ۱۰:۰۰ بجے۔

۲۸۔ سلیم اختر ،چالیس منٹ کی عورت، ص۱۰۔

۲۹۔ ارشاد علی، اردو نثر کے مضحک کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، (اسلام آباد: یونیورسٹی آف ایجوکیشن، ۲۰۱۶ء)، ص۱۱۔

۳۰۔ سلیم اختر، کڑوے بادام، ص ۲۳۔

۳۱۔ سلیم اختر، کاٹھ کی عورتیں، ص۵۹۔

۳۲۔ سلیم اختر، کڑوے بادام، ص۴۷۔

۳۳۔ ارشاد علی، اردو نثر کے مضحک کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، ص۲۵۔

۳۴۔ سلیم اختر، کڑوے بادام، ص۳۷۔

۳۵۔ ایضاً، ص۲۶۔

۳۶۔ سلیم اختر ، کڑوے بادام، ص۲۰۱۔

۳۷۔ ارشاد علی، اردو نثر کے مضحک کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، ص۲۷۔

۳۸۔ سلیم اختر ،کاٹھ کی عورتیں، ص۱۲۶۔

۳۹۔ ارشاد علی، اردو نثر کے مضحک کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، ص۲۹۔

۴۰۔ سلیم اختر ،کاٹھ کی عورتیں، ص۲۰۹۔

۴۱۔ ارشاد علی، اردو نثر کے مضحک کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، ص۴۷۔

۴۲۔ سلیم اختر، چالیس منٹ کی عورت، ص۳۵۔

۴۳۔ ارشاد علی، اردو نثر کے مضحک کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، ص۲۵۔

۴۴۔ سلیم اختر، آدھی رات کی مخلوق، ص۱۲۷۔

۴۵۔ ارشاد علی، اردو نثر کے مضحک کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، ص۲۶۔

۴۶۔ سلیم اختر ،کڑوے بادام، ص۶۴۔

۴۷۔ ارشاد علی، اردو نثر کے مضحک کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، ص ۵۳۔

۴۸۔ سلیم اختر ،کڑوے بادام، ص۶۵۔

۴۹۔ ایضاً، ص۶۹۔

۵۰۔ ایضاً، ص۸۹۔

باب چہارم

سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کی تخیلی صفات کے تحت سلیم اختر کی افسانوی نثر کا جائزہ

باب چہارم:

سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کی تخیلی صفات کے تحت سلیم اختر کی افسانوی نثر کا جائزہ

سلیم اختر نے اپنے افسانوں کے ذریعے سے اپنے تخیلات کو الفاظ کے ذریعے کاغذ پر کچھ اس عمدگی کے ساتھ اتارا کہ وہ حقیقت اور تخیل کا بہترین امتزاج بن کر قاری کے سامنے آئے۔ ان کے افسانوں میں جہاں فکری صفات اور جذباتی صفات دکھائی دیتی ہیں وہیں ان کے مضبوط اور دلچسپ تخیل کی وجہ سے ان کے افسانوں میں تخیلاتی صفات کی جھلک بھی نمایاں ہے۔

عابد علی عابد کے اسلوب میں تخیلی صفات کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فکری اور جذباتی صفات کی بنیاد تخیلی صفات ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے مطابق کوئی بھی انسان فکری اور جذباتی صفات کو تخیلی صفات میں ڈھالے بغیر بیان نہیں کر سکتا کیوں کہ حقیقتاً تخیلی سوچ ہی انسان کے ذہن سے نکل کر الفاظ کی صورت میں کاغذ پر اترتی ہے۔

عابد علی عابد تخیلی صفات کو مزید تین ذیلی نکات تجسیم، خیال افروزی اور تصویریت کو شامل کرتے ہیں۔ سلیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب اور تخیلی صفات کی ذیل میں دیکھا جائے گا۔ ذیل میں تجسیم کی صفات کو بیان کیا جاتا ہے۔

تجسیم:

عابد علی عابد کے مطابق "انگریزی میں Concreteness یا تجسیم اس صفت اسلوب کو کہتے ہیں جہاں تمثال اور پیکر تراشے جائیں اور ان باریک خیالوں کو جو ہوا کی طرح لطیف ہیں الفاظ لطیف کا جسم معنوی بخشا جائے۔ اس سلسلے میں ہم دراصل استعارے کو جو دراصل مجاز ہے تجسیم کہتے ہیں۔ تشبیہ کو بھی اس لیے شامل تجسیم کر لیتے ہیں کہ استعارہ پیدا کرنے کا وسیلہ ہے اور یوں ذریعہ حصول مجاز خود مجاز بن جاتا ہے۔"[۱]

"تشبیہ پر غور کیا جائے تو الفاظ کے معنی مجازی نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ لغت کے مطابق ہوتے ہیں۔ عبد

الرحمن کے مطابق "مجاز زیور سخن ہے۔"[۲]

مجازی زبان کے تین مقصد ہوتے ہیں۔ اول کلام کو آراستہ کرنا، دوم معانی کے مختلف پہلو اور سوم کلام میں لطف۔

تخلیقی نثر میں ایسے مقام آتے ہیں خاص طور پر ناول، افسانے اور ڈرامے میں جہاں مجاز معانی اور بیان کو پیچھے کر کے اپنی جگہ بناتا ہے۔ سلیم اختر کی افسانوی نثر استعارہ اور تشبیہ سے مزین ہے۔

سلیم اختر افسانہ "دو سیارے" میں کہانی کے مرکزی کردار کی بلا سنڈ ڈیٹ کا خاکہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> یہ بڑی ڈیشنگ قسم کی لڑکی ہے جسے امریکی اصطلاح میں ڈش (اپیل پائی) سمجھا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ پاکستانی ڈش تو ہر گز نہ تھی اور پردیس میں دیسی کھانوں کی لذت صرف پردیسی ہی جانتے ہیں۔ قد میں مجھ سے تین انچ لمبی پتلی، دبلی اور سوکھی گویا بانس نے گاگل لگا رکھی ہو۔[۳]

مندرجہ بالا اقتباس میں تجسیم کی صفت نمایاں ہے۔ مصنف نے اپنی باریک بین سوچوں کو الفاظ کی صورت میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ لڑکی کے لیے ڈش اور بانس کا استعارہ استعمال کر کے اپنا مقصد و مدعا بیان کیا ہے اور اپنے خیالات کو مجسم کر دیا ہے کہ لڑکی ڈیشنگ تو ہے لیکن کشش سے محروم اور حد سے زیادہ پتلی ہے۔

اس طرح افسانہ "محاذ" ۱۹۷۱ء میں جنگ کا ماحول اور اس سے پیدا ہونے والا خوف و ہراس بیان کیا گیا ہے: "میں جیسے سمٹ کر ذرہ بن چکا ہوں۔ در و دیوار کی درز میں سما جانا چاہتا ہوں۔ دیوار کے اکھڑے پلستر کی مانند میرا خوف زدہ وجود ٹوٹ رہا ہے۔"[۴]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے مرکزی کردار کے خوف کو استعارہ "ذرہ" اور تشبیہ "اکھڑے پلستر" کی صورت میں مجسم کر کے دکھایا ہے کیونکہ جنگ ہمیشہ موت کا سبب بنتی ہے اور مرکزی کردار پر یہ خوف حد سے بڑھ کر حاوی ہو چکا ہے اور وہ اپنے وجود کو فنا ہوتا محسوس کر رہا ہے۔

اسی طرح افسانہ "آئینہ" میں مرکزی کردار جو حادثہ کا شکار ہو کر بدصورت ہو چکی ہے اس کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> وہ کافی دیر تک چھت پر نظریں جمائے ایک چھپکلی کو دیکھتی رہی۔ آج سے پہلے اسے چھپکلیوں سے سخت گھن آتی تھی۔ ان کی گول گول آنکھیں زردی مائل جسم اور باریک نوکیلی زبان۔ یہ

سب کچھ دیکھ کر اس کے جسم میں کراہت سے جھرجھری سی آجاتی۔ مگر اب وہ خود کو ایک چھپکلی ہی محسوس کرتے ہوئے اُسے دلچسپی سے ہی دیکھ رہی تھی وہ مدتوں کی بچھڑی سہیلی ہو مگر اس کی شکل نہ پہچانی جارہی ہو۔[۵]

درج بالا اقتباس میں مصنف نے بدصورتی کی وجہ سے پیدا ہونے والی داخلی کیفیات اور سوچوں کو بیان کرنے کے لیے علامت کے طور پر چھپکلی اور بچھڑی سہیلی کو مجاز کے رنگ میں پیش کیا ہے کہ جس طرح چھپکلی کو دیکھ کر نفرت محسوس ہوتی ہے اور بچھڑی سہیلی جس کی شکل ذہن سے محو ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح مرکزی کردار کی شکل حادثے کے بعد قابل نفرت اور نا قابل شناخت ہو گئی ہے۔ مصنف نے استعارہ چھپکلی کے ذریعے بدصورتی کو مجسم کر کے دکھایا ہے۔ اسی طرح مرکزی کردار کی نفسیاتی الجھنیں اور منتشر سوچیں کھل کر قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔

اسی طرح مزید اسی افسانے میں مصنف مرکزی کردار کی صورت حال کو بیان کرتا ہے:

وہ نگار جو چڑیا کی طرح ہر وقت پھدکتی رہتی تھی اب وہ کرسی پر ٹانگیں رکھ کر پہروں اس طرح سوچ میں ڈوبی رہتی ہے جیسے اس کی آنکھیں دیوار میں کسی انجان چہرے کے نقوش دیکھ رہی ہوں۔[۶]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے نگار کی شوخ و چنچل طبیعت کو چڑیا کی تشبیہ استعمال کر کے الفاظ کے ذریعے مجسم کر کے پیش کیا ہے کہ جس طرح چڑیا ہر وقت متحرک رہتی ہے بالکل اسی طرح نگار کی شخصیت میں بھی خوشی کی تحریک ہر وقت غالب رہتی تھی لیکن اب حقیقت اس کے برعکس ہے۔

اس طرح افسانہ نگار مزید اس کی بگڑتی ہوئی نفسیاتی صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے کہ " اپنی تنہائیوں کو ایک خزانہ سمجھے ہوئے وہ ان پر کسی ناگن کی طرح بیٹھی پھنکاریں مارتی رہتی۔"[۷]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے مرکزی کردار کی تنہائی کے لیے خزانہ، خوفناک شخصیت کے لیے ناگن کا استعارہ استعمال کر کے تنہائی اور وحشت کو مجسم کر کے قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ جب انسان اپنی شکست تسلیم کر لیتا ہے اور اپنے ارد گرد تنہائی کا خول لپیٹ لیتا ہے تو یہ اکیلا پن قیمتی شے کی طرح اس کو عزیز ہو جاتا ہے اور وہ خود کو ماضی کی یادوں اور تلخیوں میں محو رکھ کر ارد گرد کے لوگوں کے ساتھ ناروا سلوک اس کی فطرت بن جاتا ہے۔

اسی طرح افسانہ "درد کا بندھن" کا آغاز کچھ اس انداز میں ہوتا ہے:

اب تو رونے کی سکت بھی نہ تھی۔ خشک آنکھیں مستقبل کی علامت تھیں۔ جس طرح ان چمکدار آنکھوں کی جوت بجھی تھی ویسے ہی آنے والا زمانہ بجھا دیپ تھا۔ اس نے پلنگ سے سر اٹھا کر دیکھا تو کمرہ دل کی طرح ویران پایا۔ بستر زندگی کی طرح اجڑا تھا۔ ان کے بغیر زندگی کیا سے کیا بن گئی ہے۔[۸]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے ایک بیوہ عورت کی دلی کیفیت کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ زمانے کے کٹھن مراحل اور تاریکی کے لیے بجھے دیپ کا استعارہ استعمال کیا ہے اور کمرے کے خالی پن کو دل کی ویرانی اور بستر کے خالی ہونے کو زندگی کے اجڑنے کے ساتھ تشبیہ دے کر دکھ اور آنے والے وقت کے خدشات اور زندگی کی ویرانی کو مجسم کر کے دکھایا ہے۔ کہ موت بیوہ عورت سے صرف اس کا سرتاج ہی جدا نہیں کرتی بلکہ اس کا سکون، خوشی اور تحفظ کا احساس بھی ختم کر دیتی ہے۔

اسی طرح افسانہ "دھرتی کی زنجیر" جس کا موضوع کسان کا اپنی مٹی اور زمین سے محبت ہے میں خشک سالی اور گرمی کی صورت حال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

ماں بیٹا دونوں خاموش تھے۔ پھر اکھٹے ہی دونوں کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں اور تانبے کے تھال میں دھرے انگارہ جیسے سورج سے جھلس کر رہ گئی اور پھر جیسے اس تپتے تھال میں دہکتے سرخ انگارے نے ایک سیاہ دھبہ اگل دیا۔ دونوں حیرت زدہ اسے دیکھتے رہے۔ وہ دھبہ بڑا ہو گیا اور پراسرار ہیولی کی بجائے ایک واضح صورت اختیار کر چکا تھا۔ گدھ، کھنڈر کا باسی، اجاڑ کا ساتھی اور مردار خور گدھ حملہ آور ہونے والے جہاز کی مانند ان کے بستی پر غوطہ زن تھے۔[۹]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے بارش نہ ہونا، قحط سالی اور گرمی کی شدت کو الفاظ کے پیکر میں سمو کر مجسم کر کے پیش کیا ہے۔ سورج کے لیے تانبے کے تھال میں دھرے انگارہ کی تشبیہ استعمال کی ہے۔ اور گدھ کے لیے سیاہ دھبہ کا استعارہ استعمال کیا ہے اور گدھ کے حملے کو جہاز کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ گرمی کی شدت اور قحط سالی کے خوف کو تصویر کی شکل میں مجسم کر کے دکھایا ہے۔ جس طرح تانبے کے تھال میں دھرے انگارہ کو چھونے سے ہاتھ جل جاتے ہیں بالکل اسی طرح گرمی کی شدت اور لو کی وجہ سے انسان کی نگاہ آسمان کی طرف مرکوز ہوتی ہے تو اس کو جلن کا احساس ہوتا ہے۔ جس طرح جہاز اچانک بستی پر آ کر گرے تو موت اور اجاڑ کا باعث بنتا ہے اسی طرح مردار کھانے والا پرندہ گدھ بستی پر حملہ آور تھا کیوں کہ قحط سالی سے موت اور اجاڑ یقینی طور پر سب کا مقدر بن چکا تھا۔ اسی طرح اس افسانے میں امید اور مایوسی کو بیان کیا گیا ہے۔

بیٹے نے ماں کے چہرے کو دیکھا۔ پیاسی دھرتی جیسے سوکھے چہرے پر یہ دو آنکھیں نہیں بلکہ دہکتے الاؤ تھے۔ اس کے برعکس بیٹے کی آنکھیں اس کے وجود کی مانند راکھ کا ڈھیر بن چکی تھیں۔ [۱۰]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے امید اور مایوسی کو مجسم کر کے پیش کیا ہے۔ ماں کی آنکھوں کے لیے دہکتے الاؤ کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ جس طرح دہکتے الاؤ روشنی بکھیر رہے ہوتے ہیں اسی طرح ماں کی آنکھیں بھی امید کی روشنی سے جل رہی تھیں اور بیٹے کی آنکھوں کو راکھ کا ڈھیر سے تشبیہ دی ہے اور اس کی مایوسی کو ظاہر کیا ہے۔

دراصل استعارہ اور تشبیہ کے ذریعے مصنف اُمید اور مایوسی کو ہمت، قوت اور بزدلی کو آمنے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے کہ اُمید ہر طرح کے ناموافق حالات کو بدلنے کی قوت رکھتی ہے جب کہ مایوسی برے حالات میں مزید تباہی کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے ہمیں ہر صورت میں اُمید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ یہی قوت مشکل حالات اور کٹھن مراحل سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح اس افسانے میں مزید کسان کا اپنی زمین کے ساتھ محبت کے جذبات کو بیان کیا گیا ہے:

اس کے نتھنے بھیگی مٹی کی سوندھی مہک کو ترس رہے تھے۔ اس نے ایسے اپنی زمین کو دیکھا جیسے دولہا سرخ جوڑے اور گہنوں کے بغیر اپنی دلہن کو دیکھے۔ یہ کھیت بھی تو اس کی دلہن تھے۔ سبز جوڑا پہنے دھانی آنچل لیے مسکراتی کھلکھلاتی ہریالی کی دلہن ماتھے پر شبنم کے موتیوں کا جھومر سجائے اور رنگ رنگ میں مہک اور مٹھاس کے وعدے لیے شادابی کی دلہن! ہر محبوب کی طرح وہ بھی اپنی محبوبہ کو خوش لباس دیکھنا چاہتا تھا مگر بے بس تھا کہ اب زمردیں لباس مہیا کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ [۱۱]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر زمین کے لیے ہریالی کی دلہن اور شادابی کی دلہن اور سبزے کے لیے زمردیں لباس کو مجاز کے طور پر استعمال کر کے زمین کو مجسم کر کے پیش کیا ہے جس طرح دلہن اپنے گہنوں اور زیورات کے ساتھ اپنے محبوب کے دل کو لبھاتی ہے بالکل اسی طرح زمین ہرے بھرے کھیتوں سے سرسبز و شاداب ہو کر کسان کے دل کو لبھاتی ہے مگر قحط سالی کی وجہ سے کسان اپنی زمین کو بغیر سجی سنوری دلہن کے روپ میں دیکھ رہا ہے اور اس صورتحال میں لاچار ہے کہ اپنی دلہن کو زمردیں لباس یعنی زمین کو شادابی دینا اس کے اختیار

میں نہ تھا۔ سلیم اختر نے مجاز کے ذریعے خشک سالی کے دوران میں کسان کے جذبات اور کیفیات کو چلتے پھرتے روپ میں پیش کیا ہے۔اسی طرح افسانے "شکتی" میں عورت کی جنسی خواہش کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

> اور تب جب جسم اچانک کمان کی طرح تن گیا حساس کانوں نے آوازیں سنی تھیں جواں مردوں کی آوازیں ایک مرد کی آواز۔۔ مردانگی کے نشے میں ڈوبی گنجیلی آواز وہ ادھر ہی آرہے تھے اور پھر وہ سب ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے ان کے سامنے درخت کے تنے سے لپٹی بیل اور سندر نار کھڑی تھی جس نے جھکا سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں کی ڈوران میں سے ایک کو باندھ چکی تھی۔ [12]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے عورت کے جسم کو کمان کے ساتھ استعارہ دے کر پیش کیا ہے۔ دراصل عورت کی جنسی خواہشیں حد سے بڑھ چکی ہیں اس کو اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کے لیے بہت سارے مردوں کی ضرورت ہے۔

افسانہ "پیر تسمہ پا" حاتم اور اس کی قوت مردی اور بانجھ پن کے گرد گھومتا ہے۔ حاتم بوڑھا ہو چکا ہے اور اپنے وجود سے رفتہ رفتہ عاجز آتا جارہا ہے۔

> پھر اسے منیر شامی یاد یاد آیا۔۔۔ یقیناً وہ زیرک شہزادہ تھا کہ جان جوکھوں میں ڈالے بغیر گوہرِ مقصود حاصل کر لیا اور مجھے کیا ملا؟۔۔۔ اس نے ایک طویل جمائی لیتے ہوئے سوچا تھکن؟ تو کیا مہم بازی کا انعام محض تھکن ہے اور نیکی کر دریا میں ڈالنے والے یوں تھک کر کٹے درخت کی مانند ڈھے جاتے ہیں؟
>
> ادھر جمائیاں تھیں کہ چیلوں کی مانند جھپٹے مار رہی تھی۔ حاتم نے خود کو ان چیلوں سے بچانے کی سعی نہ کی بلکہ ایک بے جان چھچھڑے کی مانند خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ [13]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے تھکن اور نیند کی کیفیت کو تشبیہ کے ذریعے مجسم کر کے دکھایا ہے۔ تھکن کو کٹے درخت سے تشبیہ دی ہے اور جمائیوں کو چیلوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے جب کہ حاتم کے تھکن سے چور چور ہوتے وجود کو بے جان چھچھڑے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ تھکن اور نیند ایسی کیفیتیں ہیں جن کو انسان صرف محسوس کر سکتا ہے لیکن یہ سلیم اختر کی فنی مہارت ہے کہ انہوں نے انتہائی خوب صورتی کے ساتھ ان کو چلتے پھرتے روپ میں پیش کیا ہے۔

دراصل سلیم اختر نے تشبیہات کے ذریعے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جو شخص دوسروں کی خاطر اپنی جان

کو تکلیف میں ڈالتا ہے اس کے حصے میں صرف تھکن ہی آتی ہے۔اسی طرح اس افسانے میں حاتم کے جوانی سے بڑھاپے کی طرف سفر کو بیان کرتے ہیں:

> اس نے ایک اور جھر جھری لی اور سوچا تو کیا میں اتنا ناتواں ہو گیا ہوں کہ ایک ہی زقند میں بڑھاپے نے مجھے آلیا۔اس نے بے یقینی سے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ابھی آنکھوں کے گرد کسی پرندے کے پنجے کی مانند جھریوں نے قدم نہ جمایا تھا تو پھر لہروں سے جھانکنے والا بوڑھا کون ہے۔ [۱۴]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے حاتم کی گہری سوچ کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور چہرے پر پڑنے والی جھریوں کو پرندے کے پنجے کے ساتھ تشبیہ دے کر عنقریب چہرے پر نمودار ہونے والے بڑھاپے کے آثار کو مجسم کر کے دکھایا ہے۔

سلیم اختر کی افسانوی نثر کا جائزہ تجسیم کے تحت لیا گیا ہے۔

خیال افروزی:

اسلوب کا وہ شیوہ خاص ہے اور نگارش کی وہ شعبدہ گری ہے جس کے اسرار و رموز صرف تخلیقی فنکار کو معلوم ہوتے ہیں نقاد تو بعض اوقات یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم خیال افروزی کی نشاندہی تو کر سکتے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ صفت کس طرح وجود میں آتی ہے جہاں خیال افروزی نظر آئے گی۔وہاں بالعموم رنگ ،نور نکہت اور اس قسم کے تلازمے کسی نہ کسی روپ میں پس منظر میں قائم ہیں وہاں خیال افروزی بھی ضرور موجود ہوتی ہے۔

سلیم اختر اپنے افسانوں میں لفظوں کی صنعت گری سے ایسی تخیلاتی فضا قائم کر دیتے ہیں کہ قاری سحر میں جکڑ جاتا ہے۔افسانہ "اختتام" میں سفر کی خوفناکی اور جنگل کا خوف بیان کیا گیا۔

> بعض اوقات وہ ایسی کام کی بات کرتا ہے جو ان کی مشکوک فطرت کے باوجود بھی دل کو لگتی مثلاً اس کے کہنے پر جب انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھام کر چلنا شروع کیا تو برقی رو کی مانند ایک توانائی نے دوسرے میں منتقل ہو کر ان کے گرد ایک حفاظتی حصار قائم کر دیا۔ [۱۵]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر خیال افروزی کو پیش کرتے ہیں کہ جنگل میں جب مسافر خوفزدہ تھے تو ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر چلنے سے ایک توانائی ایک دوسرے میں منتقل ہو گئی جس نے ان کے گرد

مضبوط حفاظتی دائرہ کھینچ دیا ہے۔ خیال افروزی کی نشاندہی تو کی جاسکتی ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کیسے وجود میں آتی ہے۔

مزید اس افسانے میں سلیم اختر کہتے ہیں کہ "ان کا خیال تھا کہ مرنے پر بجلی کڑکے گی سرخ آندھی چلے گی، زلزلے آئیں گے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کے دل سے محبت سے منور روشن خون نکلا۔"[16]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے خیال افروزی کی منزل پیش کی ہے۔ کہ مرکزی کردار جو سب کی بھلائی چاہتا تھا موت کے بعد اس کے دل سے محبت سے منور روشن خون نکلا ہے۔ خون سرخ رنگ کا ہوتا ہے لیکن جہاں پر خون کو منور اور روشن دکھا کر خیال افروزی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسی طرح اسی افسانے میں:

> وہ عجب جان لیوا سفر تھا۔ ان کا ایک ساتھی نگلا گیا وہ ابھی تک حقیقت کے برعکس نظر آنے والی اشیاء کے طلسمات میں اسیر تھے کہ انہیں ایک خوبصورت گائے نظر آئی۔ دودھ سفید پوتر بھرے بھرے تھن، بڑی بڑی سیاہ انکھڑیوں میں محبت کرنے والی عورت والی مٹھاس ان آنکھوں کی کشش غیر مرئی خوشبو کی طرح انہیں اپنے بازوؤں میں لینے کو بڑھی ہر ڈال مرلی بنی تھی تو پھول شہنائی ان کے مدھر سر نشہ طاری کر رہے تھے۔[17]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے خیال افروزی کے ذریعے گائے کو خوبصورت عورت کے عکس میں پیش کیا ہے اور خوشبو اور شہنائی کے ذریعے خیال افروزی کی صفت کو پیدا کیا ہے۔

اس طرح افسانہ " ظلِ ہما" میں بادشاہوں کے پیدا ہونے کی نشانیوں کو گنواتے ہیں جیسے

> جب وہ پیدا ہو تو نہ پیشانی منور تھی نہ آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور نہ ہی بشرہ سے غیر معمولی ذہانت عیاں تھی۔ اس کی پیدائش کے موقع پر بہت سے بڑے آدمیوں کی پیدائش کے دستور کے مطابق نہ آسمان پر روشن ستاروں کا ہجوم نظر آیا نہ فضا میں رنگ بکھرے اور نہ ہی روشنی کی پھلجھڑیاں چلیں۔[18]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے بادشاہوں کے پیدا ہونے کی نشانیوں کو بیان کر کے احمق اور غبی انسان کے بادشاہ بننے کو بیان کیا ہے کہ بادشاہی قسمت کا کھیل ہے یہ کسی کو بھی میسر آسکتی ہے۔

اس طرح افسانے لہو کی چھچھاہٹ میں موت کے منظر کو بیان کرتا ہے: "زمین پر عورت اب ساکت تھی اس کے بال اب حالت سکون میں تھے۔ خوفزدہ آنکھوں میں دھار کی چمک کے جگنو تھے۔"[19]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے خیال افروزی کو پیش کیا ہے کہ موت کے وقت عورت کی آنکھوں میں

خوف کے بجائے چمک کے جگنو تھے۔ اس طرح افسانے اماوس میں خوشی کا بیان کچھ اس طرح ملتا ہے:

> دن جتنا اُجلا اور دھوپ جتنی چمکیلی تھی۔ رات اتنی ہی سیاہ اور ڈراؤنی تھی کہ یہ اماوس کی رات تھی ایسی تاریک رات کے الوؤں کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور چمگادڑوں کے دل خوشی سے دھڑک اٹھیں۔ الو نے طشتری جیسے گول دیدے گھمائے تو ان میں پتلیوں کی کینوس دمک اُٹھیں۔ [۲۰]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے خیال افروزی کو پیش کرتے ہوئے اندھیری رات میں چمگادڑوں اور اُلوؤں کی خوشی کو بیان کیا ہے۔ بعض اوقات گھپ اندھیرے کمزور اور ناتواں کے لیے خوشی کا پیغام لے کر آتے ہیں۔

اس طرح افسانہ "جنون کی رات" میں سلیم اختر خیال افروزی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "جذامی زمین پر نار کے جسم سے رستا ٹپکتا اور بہتا لہو گرم مہک دے رہا ہے ایسی مہک کے من مور باؤلا ہو جائے۔" [۲۱]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے خون کی گرماہٹ اور اس کے نشے کو بیان کرنے کے لیے خوشبو کا تلازمہ استعمال کیا ہے۔ جو کہ خیال افروزی کی عمدہ مثال ہے۔

افسانہ آئینہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس کی شکل حادثے کے بعد بد صورت ہو جاتی ہے لیکن خوب صورتی کا خیال اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی کشمکش کو خواب کے ذریعے اس انداز میں بیان کیا گیا ہے:

> پاؤں کی مدور ایڑیوں سے لے کر مدھ ماتی آنکھوں کی چمک تک وہ اسی کا تو عکس تھی۔ اس کے بال تیز ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ اس کا سفید لبادہ بھی اُڑ رہا تھا اور کھلے بازوؤں میں سے اس کی کلائیاں مومی شمعوں کی طرف دمک رہی تھیں۔ اتنے میں ایک خوبصورت نوجوان آیا۔ بالکل شہزادہ سا، لڑکی کو شاید اس کا انتظار تھا۔ وہ دونوں بغل گیر ہو گئے۔ [۲۲]

اس اقتباس میں ایک خوب صورت لڑکی کا عکس پیش کیا گیا ہے۔ آنکھوں کی کشش اور خوب صورتی کو بیان کرنے کے لیے چمک بالوں کی نرماہٹ بیان کرنے کے لیے "ہوا کے جھونکوں" کلائیوں کی سفیدی بیان کرنے کے لیے "مومی شمعوں" کے الفاظ استعمال کر کے کلام میں خیال افروزی کی صفت بیان کی گئی ہے۔ یہ صفت انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار ہوتی ہے جس میں اس کے جذبات محسوسات رنگ، نور، نکہت اور خوشبو کے پیکر میں جلوہ نما ہو کر قاری کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ افسانہ اور بستی کی کہانی کفن چور سے لے کر نعش کی بے حرمتی کے

گرد گھومتی ہے جس میں تمام بستی اسی تشویش میں مبتلا ہے کہ یہ گناہ کبیرہ کرنے والا انسان کون ہے جو پکڑا نہیں جا رہا جس کو صرف نعشوں کے ساتھ دلچسپی ہے۔

اور پھر ایک دن!

"ہاں ہاں چمکیلی دھوپ میں دہشت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ فضا سے دو غیر مرئی ہاتھوں نے بڑھ کر ایک بزرگ کو دبوچ لیا۔ وہ ایک بے ضرر بوڑھا تھا۔ دن بھر گھر کی دہلیز پر بیٹھا خوبصورت ماضی کی کہانیاں سناتا یا پھر پوتے سے کھیلتا رہتا، سبھی اس کی عزت کرتے اور وہ سب سے شفقت کا سلوک کرتا۔ اس روز بھی وہ معمول کے مطابق خوشگوار دھوپ میں بیٹھا تھا کہ اچانک جیسے کسی نے اسے اُچک لیا۔ کسی کو کچھ نظر نہ آرہا تھا بس اُسے کشاں کشاں کھینچا جا رہا تھا اور وہ بری طرح سے چیختا چلاتا جا رہا تھا۔ یہ عجیب دہشت ناک منظر تھا کوئی نادیدہ قوت اُسے گھسیٹے لیے جا رہے تھی۔ اس کی چیخوں سے سننے والوں کے دل دہلے جاتے تھے۔ رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ سانسیں رک رہی تھیں مگر وہ کچھ نہ کر سکتے تھے جیسے پتھر کے بن گئے تھے اور وہ ان سب کے سامنے چیختا فضا میں تحلیل ہو گیا۔ [۲۳]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے عورتوں کی نعش کی بے حرمتی کرنے والا شخص جو پوری بستی کے لیے پریشانی اور خوف کا استعارہ بن چکا تھا۔ نادیدہ قوت کے ہاتھوں سزا پاتے اور اس کے عبرت ناک انجام کو دکھایا۔ اس کے ساتھ پس منظر میں چمکیلی دھوپ، خوشگوار دھوپ اور فضا کے تلازمے استعمال کر کے خیال افروزی کی صفت کو کلام میں نمایاں کیا ہے۔ یہ صفت تخلیق کار کی ذہنی اختراع ہوتی ہے اور تخلیق کار ہی اس کی رمز سے آگاہ ہوتا ہے۔

افسانہ "اور بستی" میں ایک مثالی آبادی کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ہر طرف امن و سلامتی راج کرتی ہے۔ ہر طرف نیکی اور اور اچھائی کا راج ہے۔

اساتذہ میں علم کی لگن تھی تو طلبہ میں علم کی پیاس، کشادہ پیشانیوں، روشن آنکھوں اور پر مسکراہٹ ہونٹوں والی اس بستی کی طہارت کا یہ عالم تھا کہ ہوا دامن جھٹک کہ ادھر سے گزرتی، وہاں سے نکلتی تو نیک نیتوں کی خوشبو سے لدی ہوتی۔ بستی پر پیار حکمران تھا۔ وہ زندگی سے پیار کرتے، زندگی بخش چیزوں سے پیار کرتے زندگی آموز باتوں سے پیار کرتے اور سب سے بڑھ کر حسن سے پیار کرتے اس لیے وہاں پھول کو شاخ سے ٹوٹ کر خوشبو کی قیمت ادا نہ کرنی پڑتی، نہ ہی تتلی کو رنگ کے جرم میں سزائے موت ملتی، نہ کبھی اس بستی کے کسی پنچھی نے پنجرے میں برہا کا گیت گایا اور نہ ہی گھر میں کسی سیاہ چشم حسینہ نے۔ وہاں چاندنی زیادہ نرم تھی، رنگ

زیادہ اُجلے تھے، دن زیادہ چمکیلے تھے اور دھوپ میں زیادہ روشن۔ [۲۴]

سلیم اختر نے اس اقتباس میں بستی میں رہنے والے لوگوں کی اچھائی نیکی، خیر کی طلب امن و سلامتی ایک دوسرے کا احترام کرنے جیسی صفات بیان کی ہیں۔ حقیقی معنوں میں بستی امن کا گہوارہ تھی جہاں ہر طرف امن اور سلامتی کا راج تھا۔

سلیم اختر بستی کا سکون اور امن بیان کرنے کے لیے خوشبو، ہوا، چاندنی، رنگ، دھوپ جیسے تلازمے پس منظر میں بیان کرتے ہوئے خیال افروزی کی صفت کو پیش کرتے ہیں۔

سلیم اختر کے افسانوی نثر کا جائزہ خیال افروزی کے تحت لیا گیا ہے۔

تصویریت:

تصویریت میں جو کچھ فن کار کو کہنا ہے وہ تمثالوں اور پیکروں کے ذریعے یعنی تصویروں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ فکر اور جذبے کی آمیزش جوں کی توں موجود ہوتی ہے لیکن کیفیت مطلوب کا انتقال بصری راستوں سے ہوتا ہے تصویروں میں باقی حواس خمسہ کی تمثالات بھی شامل ہیں۔ یہ صفت تخیل کی ابتدائی کارناموں میں ہے یعنی یہ وہ مقام ہے جہاں تخلیقی جوہر پیکر تراشتا ہے بے شک پیکر تراشی بڑی بات ہے کرامات ہے طلسمات ہے۔

افسانہ اختتام میں جنگل کی خوفناکی کا منظر بیان کرتے ہیں:

> جانوروں کا ہجوم تھا۔ چھوٹی چھوٹی مکار آنکھوں والے ہاتھی کے دانت گویا مجرم قرار دینے والی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اس کے پاس ڈاڑھیوں والے بکرے تھے جن سے بو کے بھبھکے اُٹھ رہے تھے۔ ان کے پاس مگر بکروں کی بو سے خاصے بے چین اونٹ احمقانہ انداز میں تھوتھنیاں اُٹھائے کھڑے تھے پھر گدھ تھے، چیلیں تھیں، کوے تھے، کھنکھجورے تھے اور بچھو اور سانپ حتیٰ کہ مکھیاں اور ٹڈیاں اور جھینگر بھی تماشائی تھے۔ [۲۵]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے جزئیات کے ساتھ جنگل کے جانوروں کی منظر کشی کی ہے کہ ہر منظر آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے اور قاری خود کو اس جگہ محسوس کرتا ہے۔

مصنف محض آنکھوں سے دیکھی چیزوں کو تصویر کی شکل میں بیان نہیں کرتے بلکہ وہ خیالات کو بھی تصویریت کا رنگ دیتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو ایسے الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں کہ تصویری منظر آنکھوں کے

سامنے آجاتا ہے۔اس کے ساتھ جنگل کی دہشت جانوروں کے خوف اور خود کو ان کے درمیان اسیر ہونے کی تصویر قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔اسی طرح افسانے زنجیر کا آغاز کچھ اس انداز میں ہوتا ہے کہ :

ہلتے لب، کالے کالے ہونٹ، موٹے چھوٹے باریک ،زبانیں سرخ سیاہ لمبی باتیں چھوٹی بڑی اچھی بری بحث سیاسی، مذہبی اقتصادی، آنکھیں ہلکی بندھ آدھ کھلی کان بند شور سے بند اپنی باتوں کے شور سے بند، شور ریل کا آدمیوں سے بھرے ڈبے میں شور آدمیوں سے بھری ریل کے باہر پٹریوں پر دوڑتے پہیوں کا شور۔۔۔ شور، شور، شور، باتوں بھرے ڈبے میں کسی کو زنجیر دکھائی نہ دے رہی تھی۔ زنجیر دائیں بائیں یوں ہل رہی تھی جیسے سر ہلا ہلا کر اپنی جانب متوجہ کر رہی ہو۔ کچھ کہہ رہی ہو سمجھا رہی ہو۔ منع کر رہی ہو۔ [۲۶]

سلیم اختر درج بالا اقتباس میں ریل گاڑی کے سفر کے دوران کی جزئیات نگاری کر کے ہر پل اور ہر کیفیت کی تصویریت پیش کی ہے۔اس میں مصنف زنجیر کے ہلنے کے ذریعے لوگوں کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ اپنے حق کے لیے مزاحمت کرو۔اس طرح افسانے ظل ہما میں ظل ہما کے اُڑنے کا منظر بیان کرتے ہیں:

اگرچہ ہر آنکھ کی پتلی میں ہما تھی مگر ہر پتلی میں ہما کی تصویر الگ الگ تھی بوڑھوں کے لیے اعادہ شباب کی نوید جوانوں کے لیے خوابوں کا رس کنواریوں کے لیے پیکر، محبوب نیکوں کے لیے غیبی کرشمے۔ [۲۷]

درج بالا اقتباس میں سلیم اختر نے ظلِ ہما پرندے کی تصویریت کو بیان کر کے یہ واضح کیا ہے کہ نوید، خواب، محبوب، غیبی کرشمہ کی علامت ہے۔جو لوگوں کے لیے خوشی کا باعث بنتا ہے۔اس طرح افسانہ جنون کی رات میں صبح کے منظر کو بیان کیا گیا ہے:

سورج کی پہلی کرن درختوں کی بھنگ پر اٹکے شبنم کے قطروں میں رنگوں کے آنچل لہرا دیتی، تب جنگل پرندوں کی آوازوں سے گونج اُٹھتا۔ گھاس پر سویا کوڑیالا پگڈنڈی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔درختوں سے بھوت اترتے، ڈائنیں غائب ہو جاتیں، بچھل پائیاں رخصت ہو جاتیں اور چھتنار خالی ہو جاتا۔آنکھ کھلنے پر وہ اپنا پہلو خالی پاتا۔خواب تھا یا خیال تھا؟ دھیان کی لہروں کے یادوں کے سپنے ٹوٹے بلبلوں میں وہ ضدی بلبلہ ثابت ہوتی۔ [۲۸]

اس اقتباس میں سلیم اختر صبح کے منظر کی تصویر کشی کرتے ہیں کہ یہ حسین روشن دن تمام آفتوں اور بلاؤں کے روپ بدل دیتا ہے۔

افسانہ "جنم روپ" میں سلیم اختر غروبِ آفتاب کے منظر کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

سامنے مغربی اُفق پر سورج غسلِ بحر کے لیے پانی میں اُترنے کو تھا۔ سمندر سنہری تھال میں تبدیل ہو چکا تھا۔ سنہری پارہ سے بھرا تھال نیلے پانیوں سے آتی لہریں قریب آنے پر رنگ بدلتی جاتیں۔ سنہری، سرخ، عنابی، گلابی۔۔۔ رنگوں کا آبی چمن کھلا تھا۔ خالی ساحل کی خاموشی پر، پر شور لہروں اور تیز نمکین ہوا کا راج تھا۔[۲۹]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے جزئیات کے ساتھ غروبِ آفتاب کی منظر کشی کی ہے کہ یہ خوب صورت اور دلکش منظر آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے اور قاری خود کو اس جگہ پر محسوس کرتا ہے۔ غروبِ آفتاب کے لیے غسلِ بحر کا استعارہ استعمال کیا ہے اور سمندر کے لیے سنہری تھال کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

مصنف محض غروبِ آفتاب کے منظر کو تصویر کی شکل میں بیان نہیں کرتے بلکہ اپنے خیالات اور احساسات کو بھی تصویریت کا رنگ دیتے ہیں اور اپنے خیالات کو ایسے پیکر میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں کہ ایک تصویر کی طرح منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے ساتھ پانی کی لہروں میں خوب صورت رنگوں کا امتزاج اور خاموش ساحل پر شور مچاتی لہروں اور تیز ہوا کے چلنے کی تصویر بھی قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اسی طرح افسانوی کردار نارسس کی بے تابی کو بیان کرتے ہیں:

نارسس نے ایک ٹخنہ پر دوسرا ٹخنہ رکھا یوں جیسے صلیب دیتے وقت ٹخنہ پر ٹخنہ رکھ کر لمبی میخ ٹھونکی جاتی ہے۔ اس نے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ یوں جیسے صلیب کے بازوؤں پر مجرم کے بازوں پھیلا کر ہتھیلیوں میں میخیں ٹھونکی جاتی ہیں۔ پر تناؤ، اعصاب سختی سے بند آنکھیں، کشیدہ عضلات نارسس کا جسم تختہ بنا تھا۔ وہ جسم میں اس طرح درد کی لہریں محسوس کر رہا تھا جیسے صلیب پر مجرم جسم گوشت میں اترتی میخوں کی نوک محسوس کرتا ہے۔ صلیب پر مجرم چیختا ہے، چلاتا ہے، تڑپتا ہے، گڑگڑاتا ہے، آنسو بہاتا ہے۔ مگر نارسس ساکت تھا۔ مردہ جسم کی مانند، اس کے تپتے جسم کے لیے ساحل کی ٹھنڈی ریت صلیب کا کام کر رہی تھی۔ گو آنکھیں بند تھیں مگر پپوٹوں سے چھن کر آتی دھوپ جسم میں اترتی جا رہی تھی۔ اس نے جسم اکڑا کر خشک ریت پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔۔۔ راحت کے نامانوس احساس کے ساتھ دور سے آتی موجوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ شور جو دم بدم قریب آتا جا رہا تھا اور قریب اور قریب تب موجوں نے اُسے اُچھال دیا۔ شانت ہو کر واپس جاتی موجیں اسے جھاگ کا غسل دے گئیں۔ دوبارہ آنے کے وعدہ کے ساتھ۔[۳۰]

اس اقتباس میں سلیم اختر نے نارسس کی بے چینی بے تابی کو بیان کرنے کے لیے اس کے جسم کے لیے

تختہ کا استعارہ اور مردہ جسم کی تشبیہ استعمال کی ہے۔

سلیم اختر نے نہ صرف نارسس کے جذبات کو تصویریت کا رنگ دیا ہے بلکہ اس کے خیالات و تصورات کی منظر کشی بھی کی ہے کہ تکلیف کی شدت کے باوجود نارسس خاموش ہے اور ریت کی ٹھنڈک اس کے لیے سولی کا کام سرانجام دے رہی ہے۔

سلیم اختر کی افسانوی نثر کا جائزہ تصویریت کے تحت لیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید عابد علی عابد، اسلوب (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۹۱۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۹۵۔

۳۔ سلیم اختر، کڑوے بادام (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۹۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۵۔ ایضاً، ص ۷۹۔

۶۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۷۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۸۸۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۲۰۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۱۹۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۴۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۳۴۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۰۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۷۵۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۹۱۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۹۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴۱۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۹۰۔

۲۹۔ سلیم اختر، آدھی رات کی مخلوق (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۲۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۱۔

ماحصل

اسلوب کے لیے انداز بیاں، طرز تحریر، طرز بیاں، لہجہ، رنگ، سخن جیسے مترادفات استعمال ہوتے ہیں۔اپنے خیالات و افکار کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا اسلوب کہلاتا ہے۔ ہر فرد کا اسلوب ذاتی اور شخصی ہوتا ہے۔ کیوں کہ اسلوب کسی بھی فرد کی شخصیت، خیالات و افکار، نظریات، معاشرتی اتار چڑھاؤاور ادبی رجحان کی عکس بندی کرتا ہے۔ اس لیے ہر انسان کا اسلوب منفرد ہوتا ہے۔ ادبی اسلوب دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ قابل مطالعہ ہوتا ہے۔اس لیے اسلوب میں ابلاغ کی صفت کا پایا جانالازمی ہے۔

ہر صنف ادب کے لیے مختلف اسلوب ہوتے ہیں جو اس کے موضوع کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ مشرقی اور مغربی ناقدین نے اسلوب کی تعریف و توضیح بیان کی ہے لیکن سید عابد علی عابد نے اپنی کتاب "اسلوب" میں صفات فکری، صفات جذباتی، صفات تخیلی کی ذیل میں سادگی، قطعیت، اختصار، زور بیان، گداز، مزاح، تجسیم، خیال افروزی اور تصویریت جیسی خصوصیات کو بیان کر کے اسلوب کو مزید موثر اور واضح کر دیا ہے۔

سید عابد علی عابد کے نزدیک سادگی سے مراد الفاظ اور معانی دونوں سادہ ہوتے ہیں جبکہ قطعیت میں جذبات و افکار کی وجہ سے الفاظ مشکل ہوں گے لیکن معانی بالکل واضح ہو گا اور اختصار میں اپنے مقصد و منشا کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جائے گا کہ کلام میں تشنگی باقی نہ رہے۔

زور بیان میں جذبات کی شدت کو بیان کرنا مقصود ہے اور یہ جذبات مختلف نوعیت کے ہو سکتے ہیں اور گداز میں غم، دکھ، درد اور خیال لطافت دونوں شامل ہوں گے اور مزاح سے مراد ہلکے پھلکے انداز میں ہنسنا ہے جس میں ہمدردی کا پہلو نمایاں ہو۔

تجسیم اصل میں استعارہ ہی ہے۔ خیال افروزی کے اسرار و رموز صرف تخلیق کار کو معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے نقاد یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ خیال افروزی کی نشاندہی تو کی جا سکتی ہے لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ صفت کس طرح وجود میں آئی ہے۔اس لیے جہاں خیال افروزی نظر آئے گی وہاں بالعموم رنگ، نور، نکہت کے تلازمے میں کسی نہ کسی روپ میں پس منظر میں موجود ہوں گے۔ اسی طرح تصویریت میں جو کچھ فن کار کو کہنا ہے۔ وہ تمثالوں کے ذریعے یعنی تصویروں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ فکر اور جذبے کی آمیزش برقرار

رہتی ہے لیکن کیفیت مطلوب کا انتقال بصری راستوں سے ہوتا ہے۔ تصویروں میں باقی حواس خمسہ کی تمثالات بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ صفت تخیل کے ابتدائی کارناموں میں سے ہے۔

تاریخ، ادب، عمرانیات اور نفسیات کے گہرے مطالعے نے سلیم اختر کی طرز فکر اور طرز بیاں کو انفرادی لب ولہجہ عطا کیا جس کی وجہ سے سلیم اختر کو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ایک منفرد اور مختلف مقام حاصل ہے۔ اس انفرادیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مقالے میں سلیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب: سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ موضوع کی اہمیت وضرورت کے اعتبار سے اس مقالے کی بنیاد جن سوالات پر رکھی گئی ہے وہ یہ ہیں۔ سلیم اختر کے اسلوب میں سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کی کون کون سی خصوصیات موجود ہیں؟ سلیم اختر نے اسلوب کے حوالے سے کون کون سے تجربات کیے ہیں؟ سلیم اختر کی افسانوی نثر میں فکری، تخیلی، جذباتی عناصر کس حد تک موجود ہیں؟ سلیم اختر کے اسلوب اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے کس طرح منفرد اور مختلف ہے؟ ان سوالات کی روشنی میں سلیم اختر کی افسانوی نثر کا اسلوب: سید عابد علی عابد کے تصور اسلوب کے تناظر میں پرکھا گیا ہے اور ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ ان سوالات کے تسلی بخش جوابات دیے جا سکیں۔

سلیم اختر کی افسانوی نثر کو سادگی کی ذیل میں دیکھا جائے تو الفاظ اور معانی دونوں کا استعمال سادہ دکھائی دیتا ہے جس سے مدعا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قطعیت میں سلیم اختر جذبے اور فکر کی وجہ سے الفاظ کا چناؤ مشکل کرتے ہیں لیکن معانی بالکل واضح دکھائی دیتا ہے۔ اختصار کی ذیل میں سلیم اختر چھوٹے چھوٹے فکروں اور جملوں کے ذریعے اپنا معانی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مطلب کی وضاحت میں کسی قسم کی تشنگی اور کمی باقی نہیں رہتی۔

زور بیان جس کا اظہار زیادہ موثر طریقے سے شاعری میں ہوتا ہے لیکن سلیم اختر کی افسانوی نثر میں جذبات کی شدت کی وجہ سے زور بیان کا رنگ کسی حد تک دکھائی دیتا ہے۔

میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ عابد علی عابد کے بیان کردہ اسلوب کی خوبیاں جو کسی بھی معیاری ادبی اسلوب کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ وہ سلیم اختر کی افسانوی نثر میں موجود ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کچھ عناصر قوی انداز میں نظر آتے ہیں اور کچھ کی موجودگی ہمیں قدرے کم محسوس ہوتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں سید عابد علی عابد کے

بیان کردہ تمام عناصر سلیم اختر کی افسانوی نثر میں نمایاں ہیں۔ جب کہ عابد علی عابد کے بیان کردہ عناصر میں سادگی، قطعیت اور اختصار کا بیان زیادہ پایا جاتا ہے جبکہ مزاح، گداز، زور بیان، تجسیم، خیال افروزی اور تصویریت کی صفات کسی حد تک کم استعمال ہوئی ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ایک معیاری ادبی اسلوب کی جو خوبیاں سید عابد علی عابد نے بیان کی ہیں۔ ان کے تناظر میں اگر سلیم اختر کی افسانوی نثر کو دیکھا جائے تو ان کی افسانوی نثر معیاری ادبی اسلوب کی حامل ہے۔

کتابیات

احمد، انوار۔اُردو افسانہ : تحقیق و تنقید۔ملتان:بیکن ہاؤس،۱۹۸۸ء۔

اختر ،سلیم۔آدھی رات کی مخلوق۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

اختر ،سلیم۔عورت،جنس ،جذبات۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء۔

اختر ،سلیم۔کاٹھ کی عورتیں۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

اختر،سلیم۔کڑوے بادام۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

اختر ،سلیم۔مٹھی بھر سانپ۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

اختر، سلیم۔چالیس منٹ کی عورت۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء۔

اختر، سلیم۔اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء۔

اختر، سلیم۔افسانہ اور افسانہ نگار۔تنقیدی مطالعہ،لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء۔

اختر، سلیم۔افسانہ حقیقت سے علامت تک،لاہور: مکتبہ عالیہ،۱۹۷۶ء۔

ارشد،اعجاز علی۔اُسلوب و معانی۔دہلی:مکتبہ جامعہ،۱۹۸۹ء۔

اشرف، اے بی۔کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار ۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۳ء۔

بخاری،اشفاق حسین۔ اسلوبیاتی مباحث۔اسلام آباد:شاخ زریں،۲۰۱۶ء۔

بیگ، مرزا حامد۔اُردو افسانے کی روایت ۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات،۱۹۹۱ء۔

بیگ، خلیل احمد۔اطلاقی لسانیات۔ علی:گڑھ مسلم یونیورسٹی،۲۰۰۲ء۔

پوری، اختر حسین رائے۔ادب اور انقلاب۔کراچی:نفیس اکیڈمی،۱۹۸۹ء۔

تونسوی،طاہر۔ہمسفر بگولوں کا۔لاہور:الفیصل باردوم،۲۰۱۳ء۔

ثاقب، عارف ۔بیسویں صدی کا طرزِ احساس،لاہور:غالب نما،۱۹۹۹ء۔

جمیل، عصمت۔نسائی شعور کی تاریخ۔اُردو افسانہ اور عورت۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان پاکستان،۲۰۱۲ء۔

درویش، صلاح الدین۔ اُردو افسانے کے جنسی رجحانات۔ لاہور: نگارشات، ۱۹۸۱ء۔

دی کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری (The Concise Oxford Dictionary)، (برطانیہ: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۰۵۹۔

رافع اللغات۔ لاہور: الفیصل، ۲۰۰۵ء۔

راہی، اعجاز۔ اُردو افسانے میں اُسلوب آہنگ۔ راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

سدید، انور۔ اُردو ادب کی تحریکیں۔ کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۴ء۔

سدید، انور۔ اُردو افسانے کی کروٹیں۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء۔

سعید، طارق۔ اسلوب اور اسلوبیات۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، س ن۔

صادق۔ ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ۔ دہلی: اُردو مجلس، ۱۹۸۱ء۔

صدیقی، ابواللیث۔ آج کا اُردو ادب۔ لاہور: فیروز سنز، ۱۹۷۰ء۔

صدیقی، ابواللیث۔ تجربے اور روایت۔ کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۹ء۔

عابد، علی عابد۔ اسلوب۔ لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۹۶ء۔

عبداللہ، سید۔ اشاراتِ تنقید۔ لاہور: خیابان ۱۹۶۶ء۔

عظیم، سید وقار۔ داستان سے افسانے تک۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۴ء۔

عظیم، سید وقار۔ ہمارے افسانے۔ لاہور: اُردو مرکز، ۱۹۵۰ء۔

علی، ارشاد۔ اردو نثر کے مضحک کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ۔ مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، ۲۰۱۶ء۔

فاطمہ، عزیز۔ اُردو افسانہ: سماجی و ثقافتی پس منظر۔ لکھنؤ: نصرت پبلشرز، ۱۹۸۴ء۔

کشفی، ابوالاعجاز۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء۔

کوثری، آزاد۔ نئے افسانے کی سماجی بنیادیں۔ لاہور: رہتاس بکس، ۱۹۹۱ء۔

لاہوری، جاوید۔ ''اسلوب کا مسئلہ''۔ مشمولہ اوراق، جلد ۲، جنوری ۱۹۴۷ء۔

مزاح/http://www.wekipedia.org/wiki، تاریخ ملاحظہ ۱۲ اپریل ۲۰۲۳ء، بوقت ۱۰:۰۰

بجے۔

مشتاق، صباحت۔ اردو افسانے میں اسلوب کا تنوع۔ پی۔ایچ۔ڈی، بہاءالدین ذکریا یونی ورسٹی، ملتان، ۲۰۰۴ء۔

مفتی، شاہین۔سلیم اختر: شخصیت اور فن۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۵ء۔

منظر، شہزاد۔جدید اُردو افسانہ۔کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۸۲ء۔

نارنگ، گوپی چند۔ادبی تنقید اور اسلوبیات۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۱۹ء۔

نرگسیت/http://wwwurdunotes.com/lesson تاریخ ملاحظہ ۱۲اپریل ۲۰۲۳ء، بوقت ۱۱:۰۰ بجے۔

نقوی، مظفر عباس۔اسلوبیاتی مطالعے۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۹ء۔

نیر، نور حسن۔۔ نور اللغات۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۱۹ء۔

نیو ویبسٹر ڈکشنری آف انگلش لینگویج (New Webster's Dictionary of English Language)، (امریکہ: دی ڈیلیئر پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۶ء)، ص ۹۷۳۔